پیامِ اُخوّت

تالیف: نادر النّوری

ترجمہ

أحمد عبد المُجیب الندوی

مرکز دعوت و تحقیق حیدرآباد الہند

سلام الاسلام

پیامِ اُخوّت

"مسلک و مشرب اور جزوی و فروعی اختلافات سے بالاتر ہوکر، کلمۂ توحید کی بنیاد پر، اُخوّت و محبّت کا پیام، ــــ صبر و تحمّل اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی تعلیم، ــــ باہمی احترام و اکرام اور ایک دوسرے کے لیے اخلاص و ایثار سے کام لینے کی تلقین، ــــ غیر ضروری مخالفت کے بُرے انجام کا تذکرہ بہتر سماج اور صالح معاشرہ تشکیل دینے کی ترغیب ــــ تعمیرِ سیرت، اور اصلاح و دعوت کا انداز اور داعی کے اوصاف کا بیان، ــــ اور یہ سب کچھ شُستہ زبان، علمی لب و لہجہ اور دلکش پیرائے میں شخصی زندگی کو بنانے اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لیے یہ کتاب ایک مُشفق مُعلّم اور مُخلص رہبر کا کام دیتی ہے۔"

تالیف:

○ نادر النّوری

ترجمہ:

○ احمد عبد المجیب قاسمی ندوی

مرکزِ دعوت و تحقیق، حیدرآباد (الہند)

نام کتاب : ——— پیامِ اخوّت
تالیف : ——— نادرالنّوری
ترجمہ : ——— احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی
کتابت : ——— محمد اختر حسین، محمد عرفان عالم
سرِورق : ——— سلام خوشنویس
سنہ اشاعت : ——— رجب ۱۴۱۵ھ م ڈسمبر ۱۹۹۴ء

ناشر

مرکز دعوت و تحقیق حیدرآباد (الہند) (مرکز البحث والدّعوۃ)

CENTER FOR RESEARCH AND DAWAH
AMERA BUILDING, ABIDS, HYDERABAD.
INDIA. Ph. : 203668

ملنے کے پتے

- ندوہ ایجنسی، اِرم کاٹیج، اعظم پورہ، حیدرآباد، 529101
- ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد، 523011
- حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد، 522385
- اسٹوڈنٹس بک ہاؤس، چارمینار، حیدرآباد، 564312
- قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، دریا گنج بلڈنگ، حضرت نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

4617240

بسم الله الرحمن الرحيم

ان سب کے اُٹھائے جانے کیلئے طے شدہ وقت کا دن ہے۔
وہ دن جب کوئی عزیز و قریب اپنے کسی عزیز و قریب کے کچھ کام نہ آئیگا
اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی ؛ ——— (سورۃ الدخان ، آیت ۴۱/۴۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہَوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اُخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا

علامہ اقبالؒ

ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة

فہرست مضامین

سخنہائے گفتنی : ـــــــــ مولانا محمد رضوان القاسمی ۱۳

پیش لفظ : ـــــــــ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۱۹

تأثرات : ـــــــــ ڈاکٹر عمر سلیمان الأشقر ۲۳

عرضِ مؤلف ۲۵

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے ۲۹

اجتماعیت پر خدا کی رحمت ۳۳

تعمیر نہ کہ تخریب ۳۸

فتنہ پردازی اور عیب جوئی سے احتراز کی ضرورت ۴۲

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی ۴۵

ناواقفیت ـــــــــ مخالفت کی بنیاد ۴۹

باہمی تعاون کے ساتھ تقسیمِ کار ۵۴

نزولِ رحمت میں رکاوٹ ۵۷

ثریّا سے زمیں پہ آسماں نے ہم کو دے مارا ۵۹

ایمانی رشتہ کی مضبوطی ۶۳

اقدام سے پہلے تحقیق ۶۶

داعی کا حقیقی کردار ۶۹

غلطی اور لغزش ـــــــــ کچھ سوچنے کی باتیں ۷۲

عیب میں عیب، ہنرمند ہنر دیکھتے ہیں، ... ۷۶

وحدت اور یکجہتی ـــــــ وقت کی اہم ترین ضرورت ... ۸۰

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ... ۸۳

اصلاح کا غلط انداز ... ۸۷

بدگمانی اور الزام تراشی ... ۹۰

نجات پانے والی جماعت ... ۹۶

مؤمن کا احترام ... ۹۹

اصلاح و دعوت میں تدریج کا انداز ... ۱۰۲

وسعتِ نظری ـــــــ ایک کامیاب داعی کا شعار ... ۱۰۸

شوقِ شہادت ... ۱۱۳

یہ تھے ہمارے اسلاف ... ۱۱۶

کامیاب داعی ... ۱۱۹

متلاشیانِ حق کے اوصاف ... ۱۲۴

شبہات کی تخم ریزی ... ۱۲۷

سنّت و بدعت ... ۱۳۱

امام کی اقتدا کا مسئلہ ... ۱۳۴

اللہ تعالیٰ کے ذاتی اور صفاتی نام ... ۱۳۷

ائمہ کے اختلاف کی حقیقت ... ۱۴۱

امّت کا اختلاف اور ائمہ کا کردار ... ۱۴۵

دوستی، اور دشمنی ... ۱۴۹

ایمان کے تقاضے ... ۱۵۳

علماء سے ربط ... ۱۵۷

عقیدہ کا مسئلہ ... ۱۶۰

مداہنت اور چشم پوشی ... ۱۶۳

ایمان کیلئے خطرہ ... ۱۶۸

اتباعِ حق کی اہمیت ... ۱۷۴

عملِ صالح کی ترغیب ... ۱۷۹

بیعت کی حقیقت ... ۱۸۳

عہد کی اہمیت ... ۱۸۶

رفیقِ دشت و میرِ کارواں ... ۱۹۰

منصبِ امانت کی پاسداری ... ۱۹۳

تقویٰ ـــــ شرف و فضیلت کی بنیاد ... ۱۹۹

نظم و قانون ... ۲۰۲

اصلاح کا حکیمانہ اسلوب ... ۲۰۶

داعی کا امتحان ... ۲۱۴

شعر و سخن ... ۲۱۸

دعوتِ خیر و دفعِ شر ... ۲۲۴

تربیت کے جامع اصول ... ۲۳۱

کتابیات ... ۲۳۵

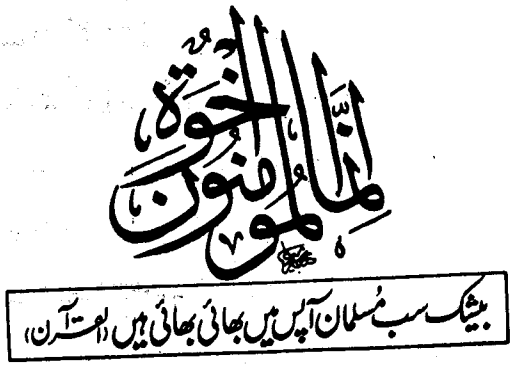
مسلمون اخوۃ
بیشک سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (القرآن)

امن و اخوت، عدل و محبت، وحدت کا پرچار کرو
انسانوں کی اس نگری میں انسانوں سے پیار کرو
آگ کے صحراؤں سے گذرو، خون کے دریا پار کرو
جو رستہ ہموار نہیں ہے، اس کو بھی ہموار کرو
دین بھی سچا، تم بھی سچے، سچ کا ہی اظہار کرو
تاریکی میں روشن اپنی عظمت کے مینار کرو
نفرت کے شعلوں کو بجھا دو پیار کی ٹھنڈی شبنم سے
ہمدردی کی فصل اگاؤ، صحرا کو گلزار کرو
عزّت، عظمت، شہرت یارو دامن میں اسلام کے ہے
وقت یہی ہے، سنگ زنوں کو آئینہ کردار کرو

دنیا ہو یا دین کی منزل، یکجہتی سے ملتی ہے
وحدت کا پیغام سُنا کر ذہنوں کو بیدار کرو
انساں کو راحت نہ ملے گی دنیا بھر کے ازموں سے
اس دنیا میں نافذ لوگو حکمِ شہِ ابرار، کرو
سُرخ سمندر والی لہریں، دُور بہالے جائیں گی
ہوش میں آؤ سبز ھلالی پرچم کو پتوار کرو
سورج بننا مشکل ہے تو جگنو ہی بن جاؤ تم
بھائی ہو تو بھائی کی خاطر اتنا تو ایثار کرو

کچھ تو اپنے ہمسایہ سے پیار کا رشتہ رہنے دو
اعجاز اپنے گھر کی اونچی اتنی مت دیوار کرو

——— • اعجاز رحمانی

سخنہائے گفتنی

اسلام کے عقیدہ و فکر کی بنیاد، اللہ کی توحید پر ایمان اور اس کی شہادت و اقرار پر ہے، مگر خدا کو ایک ماننا صرف ایک عقیدہ اور محض ایک نظریہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی عملی زندگی سے اس کا گوشت و پوست اور لحم و استخوان کا رشتہ ہے، یہ انسان کے اندر وحدت، مساوات اور انسانی و اسلامی اخوت کے شعور کو اجاگر کرتا ہے، اور خلق اللہ کے تئیں، ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا کرتا ہے، یہی اخوتِ اسلامی ہے جس نے عرب و عجم، کالے اور گورے، دولت مند اور غریب، مرد و عورت، بڑے اور چھوٹے، مختلف بولیوں کے بولنے والے، اور الگ الگ تہذیبی و تمدنی شناخت رکھنے والے دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک کلمہ پر جمع کر رکھا ہے، اور اللہ کی طرف سے اس امت کو ہر طرح کے اختلافات اور تشخصات سے ماوراء ہو کر "بنیان مرصوص" (سیسہ پلائی دیوار) بننے کی جو صلاحیت عطا کی گئی ہے، اسی نے پوری دنیا میں ان لوگوں کو مضطرب کر رکھا ہے، جو حق اور سچائی کی قوت سے خوفزدہ اور نورِ حق سے آنکھیں چرانے کے درپے ہیں،

واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون (الصف: ۸)

اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا گو کافروں کو کیسا ہی گراں گذرے،

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے اس زمانہ تک علماء، فقہا اور اکابر دین و ملت کا مختلف چیزوں میں اختلاف ہوتا آرہا ہے، لیکن مخلصین کے ان اختلافات نے کبھی بھی باہمی تعلقات میں رخنہ اندازیاں پیدا نہیں کیں، وہ بعض معاملات میں شدید اختلاف کے باوجود ملنے جلنے کے انداز میں اس کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ مشترکہ دینی و ملی مسائل میں مل جل کر کام کرنے کو ترجیح دی، ایک دوسرے کا اکرام و احترام کرتے رہے، انہوں نے اپنے فروعی، جزوی، مسلکی اور مشربی اختلافات کی وجہ سے اتحاد کی اصل بنیاد کو متزلزل نہیں ہونے دیا، اور یہ بنیادیں ہمیشہ ان کی نگاہوں میں رہیں، امت اتحاد و اختلاف کے دائرہ کو سمجھتی رہے، اور ایک دوسرے کے ساتھ کلمۂ توحید کی بنیاد پر معاملہ کو استوار رکھے، اس کے لئے ہر زمانہ میں محققین اور مخلصین علماء کوششیں کرتے رہے ہیں، علمی طور پر بہت سی کتابیں اس موضوع پر سامنے آئی ہیں، اُن میں خصوصیت کے ساتھ عربی زبان میں ابن تیمیہؒ کی "رفع الملام عن ائمۃ الاعلام" اور سعودی عرب کے شیخ عطیہ محمد سالم کی کتاب "موقف الائمۃ من اختلاف الائمۃ" کے علاوہ اردو زبان میں مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیعؒ کا رسالہ "وحدتِ امت" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، مفتی صاحبؒ کا یہ رسالہ "بقامت کہتر، بقیمت بہتر" صحیح مصداق ہے، یہ رسالہ جب کبھی زیر مطالعہ آتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس زمانہ کے علماء، مشائخ اور اداروں، تنظیموں اور جماعتوں کے ذمہ داران اس کا ضرور مطالعہ کریں، یہ رسالہ موجودہ زمانہ میں جو اختلافات ہیں، ان کو کم یا ختم کرنے میں نہایت مفید اور مؤثر ہے، اور راہ اتحاد میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مشہور کتاب "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف"

کا اردو ترجمہ مولانا صدرالدین اصلاحی نے "اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ" کے نام سے جو کیا ہے، وہ بھی لائق مطالعہ ہے، جناب شفیق الرحمٰن عباسی کی کتاب "فروعی اختلافات کی شرعی حیثیت" بھی خوب ہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ نے "الاعتدال فی مراتب الرجال" (اسلامی سیاست) کے نام سے جو کتاب تصنیف فرمائی ہے، اس میں بھی اختلاف کی حقیقتوں کو سمجھایا ہے، اور مسلمانوں کے درمیان باہمی اختلاف کے باوجود اخوت، بھائی چارگی اور اتحاد و محبت کی بنیادیں جس طرح مضبوط اور اجاگر رہنی چاہئیں، ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

یہ کتاب جو ابھی آپ کے سامنے ہے، وہ اسی اسلامی جذبۂ اخوت کو ابھارنے اور اس نعمتِ عظمیٰ کا احساس دلانے کے جذبہ سے لکھی گئی ہے، اس میں مسلک و مشرب کے اختلاف سے بالاتر ہو کر کلمۂ توحید کی اساس پر اتحاد و اتفاق کی برکات اور منافع پر روشنی ڈالی گئی ہے، ناروا تعصب اور گروہ بندی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، دعوت و اصلاح کے حکیمانہ اسلوب کی نشاندہی کی گئی ہے اور اس کے اصول و آداب بتائے گئے ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ سلف صالحین کس طرح اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ اعزاز و تکریم کا معاملہ کرتے تھے، اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ عفو و درگذر اور مسامحت و چشم پوشی کی ترغیب دی گئی ہے، بتایا گیا ہے کہ طریق کار کے اختلاف کو حقیقی اختلاف نہ سمجھا جائے، بلکہ مختلف دینی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل تصوّر کیا جائے، اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ مکمل تحقیق کے بغیر کوئی رائے قائم نہ کی جائے، اور جہاں اختلاف ہو، وہاں باہمی تبادلۂ خیال کا راستہ اختیار کیا جائے افراد کی تربیت پر بھی مؤلف کی خاص توجہ ہے۔

غرض امت کا جو اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہے، یعنی غیر مفید بحث و تکرار اور اختلاف و گروہ بندی سے اُن کی حفاظت اور تعمیری کاموں، یعنی معاشرہ کی اصلاح، دعوت و نصح اور اخوت اسلامی کے شعور کی بیداری کی طرف امت کی صلاحیتوں کا رُخ موڑنا، یہی مؤلف کے دل کی آواز اور ان کا مقصد اولیں ہے، — مضامین اور انشائیوں کے اس مجموعہ کی یہی روح اور خلاصہ ہے آپ کا جی چاہے تو اس موقع پر مولانا حالی نے اختلافِ صحابہؓ کے حال کو جس حقیقت پسندی اور دلسوزی کے ساتھ "مسدس حالی" میں بیان کیا ہے۔ موعظت و نصیحت کے طور پر ان کے اس بند کو سامنے رکھ لیجئے، ؎

اگر اختلاف ان میں باہم دگر تھا — تو بالکل مدار اس کا اخلاص پر تھا
جھگڑتے تھے لیکن نہ جھگڑوں میں شر تھا — خلاف آشتی سے خوش آئندہ تر تھا
یہ تھی موج پہلی اس آزادگی کی — ہر اجس سے ہونے کو تھا باغ گیتی

اس کے بعد کے یہ دو بند بھی قابلِ مطالعہ ہیں :

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت — نہ پوشش سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت — فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
لگایا تھا مالی نے ایک باغ ایسا — نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا
خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہباں — ہو گلہ کا جیسے نگہباں چوپاں
سمجھتے تھے ذمی و مسلم کو یکساں — نہ تھا عبد و حُر میں تفاوت نمایاں
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی — زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

جہاں تک اس کتاب (رسائل الاخیار) کے مؤلف شیخ نادر النوری کا تعلق ہے، تو وہ کویت کے ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے عم محترم —

شیخ عبداللہ النوری کا شمار کویت کے مفتیوں میں ہوا کرتا تھا، اور ٹیلیویژن پر لوگوں کے دینی سوالات کے جواب دیا کرتے تھے، شیخ نادر النوری، تحریکی ذہن کے حامل ہیں، اور انہیں فطری طور پر انہیں جماعتوں اور شخصیتوں سے لگاؤ ہے۔ جو تحریکی ذہن رکھتی ہیں علمی ذوق بھی خوب ہے۔ صلاح، تقویٰ اور تواضع ان کے نمایاں اوصاف ہیں، ان کی شخصیت میں داعیانہ جوش اور علمی وقار اور قلم میں متانت اور سنجیدگی ہے، جب کبھی میں نے ان سے ملاقات کی، ان کے اندر تواضع، انکساری محبت، خلوص اور اپنائیت کی پوری جھلک محسوس کی، دین اور ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبودی میں کام کرنے کا بے کراں جذبہ پایا، کویت کے جس ادارہ، تنظیم اور جماعت سے اُن کی وابستگی رہی، لوگوں نے انہیں "مثلِ نسیم صبح" پایا "رسائل الاخیار" میں جتنے بھی مضامین ہیں، اور اس عنوان سے کویت کے باوقار علمی مجلہ "المجتمع" کے علاوہ دیگر معروف رسائل و اخبارات میں ان کے جو مضامین طبع ہوتے ہیں، وہ قدر کی نگاہوں سے پڑھے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ "الاخوان المسلمون" سے گہری جماعتی وابستگی رکھتے ہیں، اسلئے ان کی ہر تحریر اخوانی ذہن و فکر کی آئینہ دار اور بلند اخلاق و کردار کی ترجمان ہوتی ہے،

ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت تھی کہ محترم شیخ نادر النوری کی اس وقیع کتاب "رسائل الاخیار" کو اردو کا جامہ پہنایا جائے، اور برِ صغیر کے کروڑوں مسلمانوں تک بھی مصنف کا یہ ——— "پیامِ اخوت" پہنچے، اس سلسلہ میں برادرِ عزیز مولانا بدر الحسن القاسمی (جو خود لکھنے پڑھنے کا ایک عمدہ ذوق رکھتے ہیں، اور جن کا مؤلفِ کتاب سے خاص ربط ضبط ہے، اور وہ ان کے علمی، قلمی کام اور دعوتی جذبے کی قدر کرتے ہیں) نے بھی اس کے ترجمہ کی طرف توجہ دلائی۔

چنانچہ ترجمہ کا کام عزیزی مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ (استاذ دارالعلوم سبیل السلام) کو سپرد کیا گیا، انہوں نے نہایت رواں اور سلیس اردو میں، کمالِ سلیقہ کے ساتھ اس کو منتقل کیا، اور اس خوبی سے ترجمہ کیا کہ مصنف کا پیغام قارئین تک پہنچ جائے، اور ترجمہ پن کا احساس نہ ہو ——— عزیز موصوف (جو ہندوستان کی دو ممتاز درسگاہوں کے فاضل ہیں) نے بحمداللہ ——— دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد ہی میں تعلیم کا بڑا حصہ مکمل کیا، اور یہیں اُن کی بنیادی طور پر قلمی و فکری تربیت ہوئی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے اور بھی دین اور علم کی خدمت لے،

مراقم الحروف مؤلف کا بھی شکر گذار ہے کہ انہوں نے مرکز البحث والدعوۃ حیدرآباد کو اس کے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی ——— اسی طرح مخدوم و محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، کا سراپا سپاس ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود از راہ شفقت و خرد نوازی اس کتاب کے لئے پیش لفظ تحریر فرمایا، فجزاھم اللہ خیر الجزاء،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اہم کتاب کو امت کیلئے نافع بنائے اور اسکا پیغام ہر حلقہ اور ہر طبقہ میں محسوس کیا جاسکے، اور ہمارے معاشرے اور سوسائٹی میں اس پیغام کی عملی تعبیر ملتی ہے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

محمد رضوان القاسمی
ناظم دارالعلوم سبیل السلام
و مرکز دعوت و تحقیق حیدرآباد (الہند)

یکم رجب ۱۴۱۵ھ
۵ دسمبر ۱۹۹۴ء

پیش لفظ

مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابُوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم

(ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

رسائل الاخاء (پیام اخوت) کویت کے ممتاز ادیب اور عالم شیخ نادر النوری کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو کویت کے مؤقر علمی مجلہ "المجتمع" میں موقع بموقع شائع ہوتے رہے ہیں، ——— اس وقت پوری امتِ اسلامیہ جن سنگین حالات اور خطرات سے دوچار ہے، اور اس طرح کے "اندلیشۂ طوفان" میں اس کی جو ذمہ داریاں ہیں، انہیں مختلف انداز سے مؤلف نے پیش کیا ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ مضامین جس میں اخوتِ اسلامی اور محبتِ ایمانی کی روح مکمل طور پر جلوہ گر ہے، اور جو "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق ہیں ۔ امتِ اسلامیہ کو شریعتِ مطہرہ کے بنیادی مآخذ سے استفادہ، اور باہمی چپقلش اندرونی کشمکش اور تفرقہ وانتشار سے گریز کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ دین کی خدمت اور دعوت کا کام کرنیوالے مختلف المزاج لوگوں کے درمیان اختلافِ رائے کا ظہور پذیر ہونا اور اسلامی و دینی مسائل پر غور و فکر میں اپنے مخصوص طرزِ فکر کو اپنانا ایک یقینی بات ہے، بسا اوقات تفرقہ واختلاف اور گروہ بندی کی یہ صورتِ حال تخریبی سرگرمیوں کو تقویت پہنچاتی ہے، امّتِ وحدت کے عناصر ترکیبی منتشر ہو جاتے ہیں، اور مسلمانوں کی صفِ اتحاد میں

اندرونی طور پر اضمحلال اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے،

مؤلف نے مضامین کی ترتیب میں قرآنِ حکیم اور حدیث وسنّت کے علاوہ ابن تیمیہؒ امام غزالیؒ اور ان جیسے باکمال اور باخبر علماء سلف کے افکار و نظریات سے بھرپور استفادہ کیا ہے، اور ان خطرات سے آگاہ کیا ہے، جس سے اکثر ہمارے اہل علم و اصحاب دعوت دوچار ہیں، دعوتِ دین کا کام کرنے والوں میں مختلف طرح کے جو امراض ہیں، اور موجودہ زمانہ میں ہماری دینی برادری کے درمیان وہ امراض ایک روایت بن چکے ہیں، اُن کی واضح اور دوٹوک انداز میں نشاندہی کی ہے، تعمیری سرگرمیوں میں تخریبی پہلو کی تلاش، عیب جوئی اور اپنے جہاں سے باخبری، مصلحانہ اور داعیانہ کردار کی بجائے آمرانہ اور حاکمانہ رویہ اور سلوک، افواہ طرازی اور الزام تراشی، بے ثبوت اور بلاسند باتوں کو لوگوں میں عام کرنا، نیز دین کے فعال و مخلص کارکنوں کے اخلاص عمل اور حسن نیت میں شک وشبہہ کرنا، اور اس طرح کی کئی ضروری باتوں میں مناسب و متوازن انداز میں اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔

مختلف موقعوں سے مرتب کئے گئے ان مقالات و مضامین کے مجموعہ کو "پیام اخوت" کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ کتاب کے مضامین کا زیادہ تر تعلق کارِ دعوت اصحابِ دعوت اور پوری امت اسلامیہ کی دینی صورتِ حال سے ہے،

مؤلف نے ملت کے تمام طبقات و افراد کیلئے کتاب کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش اور مفید بنانے کے مقصد سے مختصر، آسان اور عام فہم اسلوب اختیار کیا ہے، یہ کتاب تمام مسلمانوں کیلئے ہر اعتبار سے لائقِ مطالعہ ہے، کیوں کہ اس کے مضامین محبت و اخوت کی قدر و قیمت اور انسانی و تہذیبی اقدار کو اجاگر کرتے ہیں، رواداری، خدمت انسانیت، محبت اور باہمی تعاون ہی اسلامی زندگی کی وہ

حقیقی روح ہے، جو آج ہم مسلمانوں کی زندگی میں "متاعِ گم گشتہ" بن چکی ہے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخلاصِ عمل اور حسنِ نیت سے معمور یہ مضامین، امت کیلئے مفید ثابت ہوں، اخوت و محبت کی روح اس میں بیدار ہو، باہمی انس اور خیر و فلاح کے کاموں میں تعاون کا جذبہ تقویت پاتا رہے۔

یہ جان کر خوشی اور مسرّت ہوئی کہ شیخ نادر النوری کی فاضلانہ کتاب "رسائل الاخیار" کا ترجمہ ایک نوجوان ندوی فاضل مولوی احمد عبدالمجیب ندوی (استاذ دارالعلوم سبیل السّلام حیدرآباد) جنہیں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اکتساب فیض کا موقع ملا، اور تخصص فی الادب کی تکمیل کی، نے بڑی عمدگی، روانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے، انہیں اپنے اساتذہ کا پورا اعتماد حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم اور قلم کی قوت مزید بڑھائے۔

کتاب کے تعارف، اس کی افادیت و علمیت کے اعتراف کی تقریب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو بھی اپنا ایک اخلاقی و علمی فرض اور خوشگوار تقریب سمجھتا ہوں کہ اسکا اظہار کر دوں کہ فاضل گرامی مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب کی سرپرستی اور ادارت میں حیدرآباد میں ایک "مرکز البحث والدعوۃ" کے نام سے مفید تحقیقی ادارہ قائم ہے، جو اس سے پہلے بھی علمی و تحقیقی کام کر چکا ہے، اور برابر اس میں مصروف ہے۔ اور "پیام اخوت" بھی اسی کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے، مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب، نہ صرف حیدرآباد کی نسبت سے، بلکہ پورے ملک میں اپنے علمی فکر و نظر، اعتدال و توازن، اور وسعت مطالعہ کے لحاظ سے ملک کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی سرپرستی و نگرانی میں "دار العلوم سبیل السّلام" کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ بھی قائم ہے جو اپنے علمی معیار اور اعتدال فکر و نظر کے اعتبار سے ایک

امتیاز رکھتا ہے، اور راقم اس سے ذاتی طور پر بھی واقف اور اس کا قدرداں ہے۔

امید کہ زیرنظر کتاب جسے مرکز البحث والدعوۃ (مرکز دعوت و تحقیق) شائع کر رہا ہے، اردو داں حلقے کے لئے مفید اور نفع بخش ثابت ہوگی، اور اس میں اخوت و محبت کا جو پیغام دیا گیا ہے، اس پر بھرپور توجہ دی جائیگی۔

ابوالحسن علی ندوی
۲۷ نومبر ۱۹۹۴ء

دائرہ تکیہ شاہ علم اللہؒ
رائے بریلی

ڈاکٹر محمد سلیمان الاشقر

تأثرات

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں ——— درود وسلام ہو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پوری امت پر۔

عنزی کے نامور صحافی وادیب اور باکمال قلمکار شیخ نادر النوری کا مجموعۂ مضامین "رسائل الاخاء" (پیام اخوت) کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا، یہ قیمتی اور اہم مضامین جو انہوں نے کویت کے باوقار اور علمی مجلہ "المجتمع" کے ایک مستقل کالم کے ذریعہ باذوق قارئین اور اہلِ شوق تک پہنچائے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ دعوتِ حق کے راہی اور اسلام کے سپاہی، فدا کاروں اور مجاہدوں کے لئے "مینارۂ نور" اور "سرمۂ چشم" ہیں ——— ان مضامین میں بہت سارے ایسے مسائل ذکر کئے گئے ہیں جن کا تعلق اس امت کے اطبار (علماء اور داعیانِ دعوتِ حق) سے ہے کہ امت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا اور "دلِ بیمار" کیلئے مناسب دوا تجویز کرنا، جن کا اہم ترین فریضہ ہے۔

یہ مضامین مختلف موضوعات سے متعلق ہیں، ایمان واعتقاد کے مسائل بھی ہیں، فکرِ اسلامی کی سمت رہنمائی کرنے والی تحریریں بھی ہیں، انقلابِ امت، اصلاحِ حال، تعمیرِ سیرت اور تہذیبِ آدمیت پر جامع اور پُر مغز مضامین ہیں۔

کتاب کے اکثر افکار ونظریات سے مجھے مکمل اتفاق ہے، بلکہ یہ کتاب

تو پاکیزہ اور بلند خیالات کا ایک ایسا نمونہ ہے جو اہلِ دعوت اور پوری امّت کیلئے "قیمتی اثاثہ" ہے ——— تاہم بعض مسائل میں مؤلّف کی رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے، اور اختلاف اگر شرعی و اخلاقی دائرہ میں ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ——— میرے اختلاف سے ان مضامین کی قدر و قیمت کسی طرح بھی متأثر نہیں ہوگی کہ اکثر مسائل میں اتفاقِ رائے باعثِ طمانیت ہے۔ واللہ ھوالھادی الیٰ سواء السبیل۔

عمر سلیمان الاشقر

عرضِ مؤلف

حمد و سپاس اس بلند و برتر خدا کے لئے ہے جس نے اپنے منتخب بندوں کو اسلام کی بیش بہا دولت سے نواز کر عز و شرف عطا کیا، ان کے درمیان الفت و محبت پیدا کی، جس کے نتیجہ میں وہ "اخوت کا بیان" اور "محبت کی زباں" کے پیکر بن گئے، سینوں میں چھپے ہوئے کھوٹ اور دل کی تہہ میں دبی ہوئی تنگنائی کو نکالا اور آتشِ "انانیت" کو فرو کیا، اس طرح وہ اس فانی دنیا میں باہم دوست اور ہم مشرب ساتھی بن گئے اور آخرت میں وہ دیکھیں گے کہ

اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ۔ (الزخرف ۶۷)

خدا سے ڈرنے والوں کے سوا تمام دنیوی دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔

درود و سلام کی مسلسل اور ہر دم بارش ہو اس ذات پر جو خلق کا پیغامبر ہے، خدا راضی ہو ان کی آل اور اُن صحابہ سے جو افقِ ہدایت و ارشاد کے روشن ستارے ہیں، خدا خوش ہو اُن کے انصار و متبعین سے جن کا شعار اور جن کا پیام کلمۂ تقویٰ (پرہیزگاری کی بات) ہے، یقیناً وہ پوری مخلوق میں اس فرض کی ادائیگی کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے باہمی محبت اور دین کی بنیاد پر اخوت و بھائی چارگی، تقربِ الٰہی کا اہم ذریعہ ہے۔ محبت و اخوت کے

تقاضوں کی تکمیل، رضا و تقربِ الٰہی کا باعث اور اس کے حقوق کی پابندی، بلندیِ درجات کی ضامن ہے۔ مسلمانوں کی دفاعی قوت کا یہی وہ اصل راز ہے جس نے دشمن کو زیر کر دیا اور عاجز و بے بس بنا دیا، کیونکہ مسلمان قرآنی دعوت و عزیمت ایمانی قوت و صلابت اور روحانیت کے حامل تھے لیکن اب صورتحال بالکل مختلف ہے، ان کی سہل انگاری اور عیش پسندی نے انہیں ضعف و اضمحلال کی منزل تک پہنچا دیا، آسودہ اور فارغ البال زندگی کی سرمستی نے یہ دن دکھائے کہ ان کا رعب اور وقار و مرتبہ کمزور ہو گیا۔ برادرانہ نفرت کے ایسے جذبات ان میں پیدا ہوئے جس کی وجہ سے ان مسلمانوں میں پچھلی اقوام کے امراض حسد، بغض، کینہ سرایت کر گیا۔ ایک طرف ہمارے دشمن ہمارے درمیان شر و فساد کے بیج بو رہے ہیں تو دوسری طرف مسلمان ہیں کہ کسی خیر خواہ کی کوئی ہمدردانہ نصیحت ان کے کام نہیں آتی اور نہ ہی کسی واعظ و خطیب کی موعظت و تذکیر ان کے پردۂ سماعت سے ٹکرا کر انہیں باضمیر و متحرک بناتی ہے، انہیں کسی عقلی دلیل پر اعتماد ہے نہ کسی نقلی حجت و شاہد پر بھروسہ ہے، حالاں کہ یہ تمام کوششیں مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کے مقصد سے ہو رہی ہیں اور مسلمان ہیں کہ بس اپنی خوش گپیوں میں مصروف اور لہو و لعب میں مگن ہیں۔ زمانہ ان کے سامنے ہر صبح و شام سورۃ الغاشیہ[1] کا ورد کرتا اور

---

(۱) سورۃ الغاشیہ اپنے مضمون کے لحاظ سے قرآن مجید کی اہم سورت ہے۔ اس میں قیامت سے بے فکر ہو کر زندگی گذارنے والوں کے لئے تنبیہ ہے، انکی بدحواسی اور پریشان حالی کا ذکر ہے اور قیامت سے ڈرنے اور فکرِ آخرت رکھنے والوں کیلئے ابدی شادمانی اور فائز المرامی کی تصویر ہے۔ آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کریم و بندہ نواز پروردگار کی قدرت و ربوبیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی آمیز پیغام ہے کہ آپ کی ذمہ داری صرف دعوتِ حق کی (بقیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

انہیں متوجہ کرتا ہے لیکن وہ نہ ہی فکر و نظر سے کام لیتے ہیں، نہ سمع و طاعت کو اپنا شعار اور رہنما بناتے ہیں۔

اولا یرون انھم یفتنون فی کل عام مرۃً او مرتین ثم لا یتوبون ولا ھم یذکرون۔ (التوبۃ:۱۲۶)	کیا یہ نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ ہر سال ایک بار یا دو بار کسی آفت میں پھنستے ہی رہتے ہیں پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ وہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

آہ ـــــ! ان کی وحدت و جمعیت کے تار و پود بکھر گئے، شیرازہ بندی کے اجزاء ہواؤں کی نذر ہو گئے، ہر شہر ہر ملک میں الگ حکومت اور امیر اور الگ تخت و سریر ہیں۔ ہر پڑوسی اپنے پڑوسی کا "رفیق" کیا ہوتا "فریق" بنا بیٹھا ہے، کسی کے ظلم سے پڑوسی کی حفاظت کیا کرتا خود ظلم کرنے لگا ہے، دفاع کی بجائے خود حملہ کرنے لگا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہونے اور مدد لینے میں بہت آگے ہے۔

یأخذون عرض ھذا الادنی ویقولون سیغفر لنا۔ (الاعراف:۱۶۹)	(لیکن) اس دنیا کا مال لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری تو ضرور مغفرت ہو جائے گی۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تبلیغ ہے، ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کرنے والوں کو بالآخر خدا تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ ان سے ہر چیز کا حساب کتاب لے کر رہے گا، مجرمین کے چہرے اس دن اترے اور تھکے ہارے ہوں گے، وہ دہکتی آگ میں ڈال دیئے جائیں گے، کھولتے چشمے کا پانی اور کانٹے دار درخت انکی غذا ہوگی، اطاعت گذاروں کے چہرے اس دن شگفتہ ہوں گے اپنی کوشش پر شاد و مطمئن، اونچے باغ میں، اس میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔ چشمہ رواں ہوگا تخت بچھے ہوں گے، آبخورے قرینے سے دھرے اور غالیچے ترتیب سے لگے اور تکیے ہر طرف پڑے ہوں گے۔ قدرت کا یہ بامقصد کارخانہ زمین و آسمان کا غیر معمولی نظام اور دشت و جبل کا یہ حیرت انگیز انتظام سب اس کی خالقیت کے شاہکار ہیں ـــ بس اطاعت گذاروں کیلئے بہتر جزاء ہے اور نافرمانوں کے لئے بدتر سزا۔ (مترجم)

نتیجۃً اسلام اور مسلمانوں کے دشمن دن بہ دن طاقتور ہوتے جارہے ہیں اور اسلام کی عظمت وشوکت کا دائرہ سمٹتا جارہا ہے۔ مسلمانوں کی آواز پست اور ہمت و حوصلہ ماند پڑتا جارہا ہے۔ یہ کچھ ایسے حالات ہیں جو اہلِ ایمان کے لئے یقیناً کسی طرح خوشگوار اور سازگار نہیں ہوسکتے۔

"رسائل الاخبار" (پیام اخوت) کے ذریعہ ہم چاہتے ہیں کہ خلف اپنے سلف کی عظیم روایات کی پیروی کریں۔ ان کے مقررہ خطوط پر اپنے مستقبل کی تعمیر کریں، اس تفرقہ اور انتشار سے باز آجائیں جو ان کی صف میں رخنہ اندازی کرتا اور ان کی قوت وشوکت کو گھُن کی طرح کھا جاتا ہے۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ میری اس کوشش کا مقصد اپنی ذات کے لئے کسی کریڈٹ کا حصول، خود پسندی یا ناحق طور پر کسی طرح کی خوش فہمی ہرگز نہیں ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نصح وخیر خواہی کی میں نے کوشش کی ہے، نہ جانے میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ میری یہ سعی وکاوش اگر شرفِ قبول نہ پاسکے تب بھی یہ میرے لئے باعثِ تقویت ہے کہ میں نے کوشش ضرور کی ہے، اسلئے "مجتہدِ مخطئ" (کارِ خیر میں نادانستہ غلطی کرنے والے) کا اجر و ثواب ضرور حاصل ہوگا۔

وَاللہ وَلی التوفیق وھو حسبی ونعم الوکیل،

نادر النبوری

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

یہ پیام محبت ہر اس مسلمان کے نام ہے:

جو دین و مذہب کے تئیں اپنے دل میں گوشۂ درد رکھتا ہو، اور دعوتِ دین اور اس کے وسیع حدود و آفاق کے لئے اپنی جان، مال، وقت اور صحت و توانائی کا گرانقدر حصہ عطا کرنے کا حوصلہ اور دلچسپی رکھتا ہو۔

یہ پیغام اس مسلمان کے نام بھی ہے:

جو اس صورتِ حال پر بے چین اور تڑپ اٹھتا ہو کہ اسلامی داعیوں کی کوششوں اور اسلام پسندوں کی تعداد میں اضافہ کے باوجود اسلام پیچھے ہوتا نظر آرہا ہے، دشمن لابی کا تسلط ہے اور بہ ظاہر اسلام کی قوت و شوکت زوال پذیر ہے۔

اس مسلمان کے نام:

جو مشترکہ دینی مقاصد کے تحت مختلف مکاتبِ فکر کے زاویۂ نگاہ کا ارتکاز چاہتا ہو، تاکہ دعوتِ اسلامی کا کام زیادہ بہتر طور پر انجام پائے اور مفید نتائج برآمد ہوں۔

اس دینی و اسلامی بھائی کے نام:

جو اجتماعیت کو عزیز رکھتا ہو اور اختلاف و انتشار کو ناپسند کرتا ہو

اور اس حقیقت سے واقف ہو کہ مسلمانوں کی آزمائش کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ، ان کی فرقہ واریت اور گروہ بندی ہے اور ان کی فتح و ظفرمندی کا بنیادی راز، ان کا رشتۂ محبت و آہم آہنگی ہے' (حضرت امام مالک کی) یہ بات کس قدر صحیح اور حقیقت افروز ہے کہ اس امت کے آخری طبقہ کی اصلاح و تربیت ان ہی اصول و خطوط پر ممکن ہے جن پر اس امت کے پہلے طبقہ کی اصلاح و تربیت کی گئی تھی۔

ان مختلف النوع مضامین کا مقصد' دین و مذہب کے غیر حقیقت پسندانہ' قدیم مباحث اور فرسودہ مناقشات کو چھیڑے بغیر اہلِ قبلہ (مسلمانوں) کے مختلف نقاطِ نظر کو باہم قریب اور مربوط کرنا ہے تاکہ ہم "کلمۂ حق" کی بنیاد پر داعیانِ دین، زعمارِ ملت، اصلاح و تربیت کے ذمہ داران، علماء اور ائمہ کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے داعیانہ کردار ادا کر سکیں۔

اور اس سلسلہ میں یہ سنہری اور قیمتی اصول پیشِ نظر رہے کہ

"ہم متفقہ مسائل میں دستِ تعاون دراز کریں اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کو معذور سمجھیں"

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں[1]!

اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو باہم دوست، بھائی، ایک دوسرے کا مددگار و غمخوار اور ہمدم و دمساز بنایا ہے اور انہیں افتراق و اختلاف سے بالاتر ہو کر انس و محبت اور میل ملاپ کے رشتہ کو مستحکم کرنے کی تعلیم دی ہے۔

وَاعتَصِمُوا بِحبلِ اللہِ جمیعاً وَلا تفرقوا۔ (آل عمران: ۱۰۳) — اللہ کی رسی سب مل کر مضبوط تھامے رہو اور باہم نااتفاقی نہ کرو۔

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۳/۴۱۹ — ۴۲۱ (باختصار)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شیئ انما امرھم الی اللہ ۔ (الانعام : ۱۵۹)

بیشک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، آپ پر ان کی کچھ بھی ذمہ داری نہیں، ان کا معاملہ بس اللہ ہی کے حوالہ ہے ۔

سلسلۂ نبوت کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے تفرقہ پردازی اور اختلاف کا یہ شیوہ کیوں کر روا اور درست ہو سکتا ہے؟ اور اس پاکیزہ امت کے کسی فرد کے لئے یہ بات کس طرح مناسب ہے کہ وہ امت کے ایک طبقہ سے دوستانہ سلوک رکھے اور کسی دلیل شرعی کے بغیر اسی امت کے دوسرے طبقہ کے ساتھ محض ظن و گمان اور ذہنی تحفظ کی بنیاد پر معاندانہ رویہ اختیار کرے، جب کہ اللہ نے اس عمل سے اپنے نبی کی برأت ظاہر کر دی ہے؟ ۔

یہ تو اہل بدعت کا شیوہ ہے جیسے خوارج کہ وہ مسلمانوں کی اجتماعیت سے کنارہ کش ہوئے اور اپنے مخالفین کی خوں ریزی کو انہوں نے جائز قرار دیا لیکن اہل سنت والجماعۃ کا امتیاز یہی ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں ——— یہ بات کس قدر سطحی معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کسی متقی اور پرہیزگار کو نظر انداز کرتے ہوئے اس شخص کو فضیلت و مرتبہ عطا کرے جو محض اس کی خواہش نفس کی تائید کرتا ہو، حالانکہ فضیلت کا معیار تو ورع و تقویٰ، خدا اور اس کے رسول کی محبت، رضا اور خوشنودی ہے، خدا و رسول جس کو محبوب رکھتے ہوں اسے محبوب رکھا جائے اور وہ جس کو مبغوض کہیں وہ ہر شخص کی نگاہ میں مبغوض ہے ۔ نیز ملت کی افضلیت اور اس کی معراج و ترقی کا راز یہ ہے کہ مسلمان ایک اکائی

بن جائیں ــــــــــــــــــ

حیرت ہے کہ بعض لوگ مسائل و معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے کی تضلیل و تکفیر (گمراہ اور کافر قرار دینا) کے تیر چلاتے ہیں، جب کہ وہی مظلوم حق و راستی کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور شریعت کی تائید اس کے ساتھ ہوتی ہے اور بالفرض اگر آپ کے ایک مسلمان بھائی سے دین کے کسی معاملہ میں غلطی اور چوک ہو جائے تو کیا غلطی کرنے والا ہر شخص کافر و فاسق ہو جاتا ہے؟ آخر "خطا و نسیان" بھی تو کوئی چیز ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے۔ پیغمبر اور مومنین کی دعا کے ذیل میں اس دعا کو ملاحظہ کیجئے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔ (البقرۃ: ۲۸۶)

اے ہمارے پروردگار ہم پر گرفت نہ کر، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اس دعا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے یہ دعا قبول کر لی ــــــــــــــــــ

اسلام کے کسی معاملہ میں آپ کی جو موافقت اور تائید کرے اس کو ہم نوا اور ہم خیال سمجھا جاتا ہے۔ اور یہی شخص محض حق کی بنیاد پر آپ سے اختلاف کرتا ہے تو اس کی جان، مال، عزت و آبرو کے لالے پڑ جاتے ہیں، کیا انسانی اور اسلامی حقوق کا ہمیں پاس و لحاظ نہیں ــــــــــــــــــ یاد رکھئے امت کے درمیان نئے نئے ناموں کے ذریعہ تفرقہ پیدا کرنا، جن کی کتاب و سنت میں کوئی سند و ثبوت نہیں، کسی طور روا نہیں۔

اجتماعیت پر خدا کی رحمت

حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کے بغیر صرف وقتی جوش و خروش، موقتی اور عارضی مصالح اور بعض موسمی حالات و تقاضوں کے زیرِ اثر ظہور پذیر ہونیوالی اکثر اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں حوادثِ زمانہ کی نذر ہو جاتی ہیں، جن جماعتوں کے ساتھ اللہ کی توفیق شاملِ حال رہتی ہے، وہی پنپتی اور برگ و بار لاتی ہیں، ورنہ ہر تحریک و جماعت کا انجام ناکامی ہی ہوتا ہے۔

لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّا اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ۝ (التوبۃ : ۱۱۰)

ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (کانٹے کی طرح) کھٹکتی رہے گی ہاں مگر ان کے (وہ) دل ہی فنا ہو جاویں تو خیر اور اللہ بڑا علم والا اور بڑا حکمت والا ہے۔

اختلاف یا اتفاقی کو جنم دینے والے اسباب عام طور پر فکری سے زیادہ شخصی ہوتے ہیں لیکن رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ شخصی اسباب بھی فکری و نظری اسباب کا روپ دھار لیتے ہیں، گویا کسی فرد کی انفرادیت اور امتیازی تشخص کو تسلیم کرنا ہی، اس کے فکر کو قبول کرنا ہے ——— شخصی اختلاف کو فکری اختلاف میں بدلنے والے وہ اسباب واقعی اگر حقیقی اور سنجیدہ ہیں تو تمام اختلافات آناً فاناً رفع ہو سکتے ہیں اور اختلافات کے ماحول میں

بھی حق کی تلاش ممکن ہے۔ یہاں تک کہ جب حق واضح ہو جائے تو سب لوگ اس کے سامنے پست ہو جائیں کہ حق، شرعی دلائل پر مبنی اور حقیقت و واقعیت سے قریب تر بلکہ بالکل مطابق رائے کو واضح کرتا ہے اور ان لوگوں کی ذہنیت کو بھی منظر عام پر لاتا ہے جو اس "سچی رائے" کے لیے بھی اپنے دل میں تعصب رکھتے اور اجتماعیت و وحدت کا خون کرنا چاہتے ہیں اور خرافات و واہیات کا سہارا لے کر امت میں مزید پھوٹ پیدا کرنے کی دیوانہ وار اور مسلسل کوشش کرتے ہیں اور بسا اوقات ایک چھوٹے سے گھر کے افرادِ خاندان میں بھی معمولی بات کو پہاڑ بنا کر اختلاف و ناراضگی کی خلیج پیدا کر دیتے ہیں، فرقہ واریت اور گروہ واری روح کو محلہ، مسجد، شہر اور گاؤں، ہر سطح سے پھیلانے میں مصروف رہتے ہیں، انتشار اور پھوٹ کی ذہنیت رکھنے والوں کی زبان نہ صرف مسجد اور محلہ میں خاموش نہیں رہتی بلکہ یہ اگر کسی اجنبی شہر یا ملک کا سفر کریں تو وہاں بھی انتشار پیدا کر کے واپس لوٹتے ہیں ——— یہ صورتحال اگر کوئی اشارہ دیتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ صرف نام کے مسلمان ہیں، اسلام ان کے قلب و روح میں جاگزیں نہیں ہوا، اسلامی تربیت سے وہ مکمل طور پر بے خبر ہیں۔

میرے دینی بھائیو! شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی چند باتوں پر ہم اور آپ ذرا غور کریں، ان کی چند مفید نصیحتیں ہم سبھوں کے نام ہیں، فرماتے ہیں:

"زعیم" عربی زبان کا وہ لفظ ہے جو نگہبانی اور ضمانت کے مفہوم کو شامل ہے، اللہ کا ارشاد ہے ولمن جاء بہ حمل بعیر وانا بہ زعیم (یوسف: ۷۲)

اگر کوئی شخص کسی بھی جماعت کے امور و معاملات کا کفیل اور

نگراں ہو جائے تو وہ "زعیم" (قائد) کہلاتا ہے، اَب اگر وہ کسی خیر اور نیکی کا رہنما و ذمہ دار ہے تو قابلِ تحسین و آفریں ہے۔ اور اگر کسی شر کا داعی اور ضامن بنا ہے تو لائقِ مذمت و نفرت ہے۔

اسی طرح "رَأس الحزب" (سَردارِ گروہ) کا مطلب یہ ہے کہ وہ افراد کی مشترک ٹکڑیوں اور جماعتوں کے متحدہ مجموعہ کا رئیس و قائد ہے، ——— اَب اگر اس جماعت کے تمام افراد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر بلا کم و کاست عمل پیرا ہیں تو وہ مؤمن ہیں، ان پر مسلمانوں (اہلِ ایمان) کے احکام نافذ ہوں گے اور اگر ان لوگوں نے کچھ کمی یا زیادتی کی، مثلاً اپنے گروہ میں داخل ہونے والے کسی فرد سے تعصب برتا اور جو اپنے گروہ اور جماعت میں داخل نہیں ہوا، اس سے اعراض اور کنارہ کشی اختیار کی، خواہ یہ عمل حق و باطل کی بنیاد پر کیوں نہ ہو ——— یہ تفریق اور انتشار ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول نے مذمت بیان فرمائی ہے، اس لئے کہ خدا و رسول نے امت کو اجتماعیت اور انس و محبت کا حکم دیا تفرقہ و اختلاف سے باز رہنے کی تلقین کی، نیکی اور تقویٰ پر تعاون، بدی اور باہم گناہ پر عدمِ تعاون کی ہدایت دی ہے، درج ذیل حدیثوں پر عبرت کی نگاہ ڈالئے اور ان کو بصیرتِ قلب سے پڑھئے:

مثل المؤمنين في	آپس کی شفقت، محبت و الفت
توادهم وتراحمهم	اور ہمدردی میں ایمان والوں
وتعاطفهم كمثل	کی مثال ایک جسم کی سی ہے
الجسد اذا اشتكى منه	کہ اگر اس کے کسی عضو میں

عضو تداعی له سائر الجسد بالسهر والحمیٰ (۱)

تکلیف ہو تو سارے اعضاء جسم تپ اور بے خوابی میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے کہ ایک دوسرے کو قوت پہنچاتا اور سہارا دیتا ہے، جیسے عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کا سہارا بنتی اور قوت پہنچاتی ہے" اس کے بعد آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال دیں (اور اس طرح مسلمانوں کے باہمی تعلق اور قرب کو واضح فرمایا) (۲)

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اسے کوئی تکلیف دیتا ہے، نہ اس کی بے عزتی کرتا ہے (۳)

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا کہ مسلمان پر مسلمان کے پانچ حقوق ہیں:

(۱) سلام کا جواب دینا۔
(۲) مریض کی عیادت کرنا۔
(۳) جنازے کے ساتھ جانا۔
(۴) دعوت قبول کرنا۔
(۵) چھینک کا جواب دینا۔ (۴)

---

(۱) صحیح مسلم، ص: ۲۵۸۶۔
(۲) صحیح بخاری (فتح ۱۳/۵۸) صحیح مسلم، ص: ۲۵۸۵۔
(۳) بخاری مع الفتح ۱۵/۳۵۸۔ مسلم، ص: ۲۵۶۴۔
(۴) صحیح مسلم، ص: ۲۱۶۲۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث ذہن میں رکھیے:
آپؐ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم[1]
(ظالم کو ظلم سے روکنا اس کی مدد ہے)
آپؐ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے"[2] [3]۔

(۱) صحیح بخاری (فتح ۱۵/۳۵۸)

(۲) صحیح بخاری (فتح ۱/۶۳)

(۳) مجموع الفتاویٰ (ابن تیمیہؒ) ۱/۹۲-۹۳۔

تعمیر نہ کہ تخریب

باہمی عداوت، نفرت، بغض، اہانت، کردار کشی، الزام تراشی اور ایک دوسرے کا ذکرِ شر ——— کیا یہ حاملینِ ایمان اور داعیانِ اسلام کا شیوہ ہے؟ اس سوال کا جواب ہر مسلمان کے پاس یہی ہے کہ "بخدا ہرگز نہیں"۔ اس لئے کہ مؤمن فطری طور پر تعمیر کے ساتھ تخریب کو پل بھر کیلئے برداشت نہیں کر سکتا۔ میدانِ جہاد اس اصول سے مستثنیٰ ہے کہ اس میں بیک وقت تعمیر و تخریب کی سب ہی کو گنجائش اور رخصت ہے۔ ہمارے دین میں تعمیرِ اخلاق اور بلندی کردار پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ آدمی اپنی انفرادی عبادت کا اجر و ثواب پائے، یہ بہتر ہے اس بات سے کہ وہ نصح و خیر خواہی کے جذبہ کا دعویٰ کرتے ہوئے اپنے اہلِ دعوت مؤمن بھائیوں کا گوشت نوچے (اور ان کی غیبت کرتا رہے) بالفرض اگر کسی آدمی میں کوئی خامی یا عیب نظر آئے تو مؤمن ہونے کی حیثیت سے یہ بات ضروری ہے کہ وہ اپنے فریقِ مخالف کے لئے عذر تلاش کرتا رہے، کسی کو کافر یا فاسق قرار دینے کا جذبہ، افترا پردازی یا جاہلی عصبیت کے نشہ میں سرمست ہو کر اللہ کی حدود سے تجاوز اور احکامِ شرع سے سرتابی نہ کرے۔ اس لئے کہ اگر کوئی شخص آپ کے سلسلہ میں معصیتِ

خداوندی کا ارتکاب کر رہا ہو تو آپ اسے اس سے بڑھ کر بہتر اور کیا بدلہ و تحفہ دے سکتے ہیں کہ آپ اس شخص کے بارے میں خدا کے حکم کی اطاعت کریں۔ بدکلامی کا جواب شیریں کلامی سے، بداخلاقی کا جواب بلند کرداری سے اور بغض و نفرت کا جواب انس و محبت سے دیں۔ قرآنِ حکیم کی یہ دو آیتیں آپ کو اسی طرف دعوت دیتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی انسان کے شرف و کمال کو اونچا اٹھاتی ہیں۔

انّ اللّٰہ مع الذین اتقوا والّذین ھم محسنون۔ (النحل: ۱۲۸)	بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ رہتا ہے جو تقویٰ اختیار کئے ہوتے ہیں اور جو لوگ کہ حسنِ سلوک کرتے رہتے ہیں
وان تصبروا وتتقوا لایضرکم کیدھم شیئاً، انّ اللّٰہ بما یعملون محیط۔ (آل عمران: ۱۲۰)	اور اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کئے رہو تو تم کو ان کی چالیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی، بے شک اللہ انکے اعمال پر پورا احاطہ رکھتا ہے۔

آپ اپنے ہر قول و فعل اور تمام حرکت و عمل کو نوٹ کریں اور اسے عدل و انصاف کی میزان میں ناپ تول کر دیکھیں۔

ولا یجرمنکم شنآنُ قومٍ علیٰ ان لاتعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ۔ (المائدہ: ۸)	اور کسی قوم کی عداوت تم کو عدل سے نہ روک دے، عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

اپنے آپ کو اس کتاب کا پیروکار اور پابند بنائیں جسے اللہ نے انسانیت کے لئے ہدایت نامہ بنا کر نازل کیا ہے اور اختلاف کی ہر سطح اور ہر مرحلہ پر حاکم و فیصلہ کن بنایا ہے۔

فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر۔ (النساء: ۵۹)

پھر اگر تم میں باہم اختلاف ہو جائے کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دیا کرو، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

اللہ تعالیٰ حضرت امام حسن البنا شہیدؒ کو جزاء خیر دے، کیا خوب فرمایا:

"فروعی اور جزوی مسائل میں اختلاف رکھنے والوں کے لئے ہم ہمیشہ عذر تلاش کرتے اور انہیں معذور سمجھتے ہیں، ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ اختلاف باہمی رشتۂ محبت، میل ملاپ، قلبی تعلق، خیر کے کاموں میں اور اشتراک و تعاون کی راہ میں کبھی حائل نہ ہو۔ ان فروعی اختلافات کے باوجود ہم اسلام کے وسیع تر معنی و مفہوم میں متحد و مشترک ہیں، ہم سبھوں کے مسلمان ہونے کی نسبت سے اسلام ہم سب پر سایہ فگن ہے۔

کیا ہم سب یہ نہیں چاہتے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے انس و محبت رکھیں؟ کیا ہم اس حکم شرعی کے پابند نہیں ہیں کہ جو چیز ہم اپنے لئے پسند کریں وہی دوسرے کیلئے بھی پسند کریں؟ تو پھر آخر اختلاف کس بات میں ہے؟ آخر ہماری اپنی رائے اور فکر دوسروں کے یہاں اور دوسروں کی ہمارے یہاں قابل غور اور لائق اعتنا کیوں نہیں ہو سکتی؟ یقیناً ہو سکتی ہے، جب مفاہمت کی مشترک بنیادیں موجود ہیں تو کیوں نہ ہم خلوص و وفا کی فضاء اور دوستانہ ماحول میں صلح پسندی اختیار کریں؟

ان تمام باتوں پر غور و فکر سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مسلمان وہ ہیں جو اپنے مخالفین کے ساتھ فراخ قلبی سے پیش آتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر قوم اور ہر جماعت کا ایک رہبر و داعی ہے اور ہر دعوت میں حق و باطل کی

معرکہ آرائی ہے، وہ حق کی تلاش میں رہتے اور اسے پالیتے ہیں، بڑی نرم خوئی اور سلامت روی کے ساتھ اپنے مخالفین کو اپنے نقطۂ نظر سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر مخالفین ان کے فکر و خیال سے مطمئن نہ ہوسکیں تو وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ ہمارے دینی بھائی ہیں، ہم ان کے لئے اللہ ہی سے ہدایت و توفیق کے خواستگار ہیں۔"

اسلامی دعوت کا کام انجام دینے والے یہ محسوس نہ کریں کہ وہ کسی جنگ و جدال کے میدان میں ہیں بلکہ اپنے آپ کو تعاون و اشتراک کے وسیع میدان میں حرکت و عمل کا خوگر بنائیں اور تعاون کی مضبوط بنیادوں پر عمل کی دیوار اُٹھائیں۔

فتنہ پردازی اور عیب جوئی سے احتراز کی ضرورت

دینی دعوت کا جو لوگ کام کرتے ہیں ان میں سے بعض کے اندر ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے عیوب و نقائص اور کمزوریوں کی اصلاح کی بجائے دوسروں کی "عیب جوئی" اور "خطا شماری" میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے سرمایۂ عمل کے ضائع اور برباد ہونے اور قلب کے فاسد ہونے کا اس سے بڑا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا، آدمی کے عیب اور نقصان و خسارہ کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ لوگوں کے ظاہر و باطن میں جھانکے، نیک، صالح اور مصلحین کے عیوب کی جستجو کو اپنا مشغلہ بنائے اور جس شخص کا یہ حال ہو وہ کسی نہ کسی دین اسلام دشمنوں کا آلۂ کار بن جاتا ہے اس لئے کہ جو شخص بھی اسلام کا دعویٰ کرے، برے اور بداخلاق معاشرہ اور شرابی شباب کی سوسائٹی سے میل جول ختم کرے پھر عام مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں ڈالنے اور جادۂ حق سے انحراف پر آمادہ کرنے اور دوسروں کی اہانت و توہین پر اتر آئے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔

شیخ عبدالرحمان عبدالخالق نے اپنی تصنیف "الولاء والبراء" میں صحیح لکھا ہے کہ "آج مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں "آستین کا سانپ" کہا جا سکتا ہے، جو اپنے زعم اور خیال میں دین و شریعت اور اس کے ابدی پیغام کی اشاعت اور کلمۂ حق کی تبلیغ میں مشغول ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ

کہ وہ اہلِ شرک و کفر، صنم پرستوں اور اباحیت پسندوں کو چھوڑ کر (جو تبلیغ و دعوت کا اصل اور صحیح میدان ہے) اپنے قلم اور زبان کا نشتر مسلمانوں پر چلاتے ہیں بلکہ ہم تو ایسے لوگوں سے بھی واقف ہیں جن کا مشغلہ ہی داعیانِ حق کو بدنام کرنا، مختلف قسم کے لٹریچر اور مضامین کی اشاعت کے ذریعہ انکی نیک نامی کو متاثر کرنا، مداہنت اور ظلم پسندوں کی طرف میلان کا الزام دینا، بعض جرائم کے ارتکاب کو ناحق طور پر ان سے منسوب کرنا اور دین کے کسی مسئلہ میں ان کی رائے اور مزاج کے خلاف فتویٰ دینے پر بُرا بھلا کہنا ہے۔ اس طرح کی باتوں میں جب وہ اپنی مرضی کی خلاف ورزی پاتے ہیں (حالانکہ اُن داعیانِ دین کی زندگی عین اصول پسندی پر مبنی ہے) تو وہ ان اسلامی داعیوں کی عزت و آبرو کی بے حرمتی کرتے ہیں اور اس بات کی کوشش میں اپنے وقت کو صرف کرتے ہیں کہ کسی طرح ان کے رازہائے سربستہ اور اندرونِ خانہ کی باتوں کا سراغ لگ جائے تاکہ وہ انہیں طشت از بام کرسکیں گویا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ اور دلچسپ موضوع یہ ہوتا ہے کہ وہ داعیانِ حق کو آپس میں ٹکرادیں، ان کی اجتماعیت اور وحدت میں رخنہ ڈال دیں اور عام لوگوں کے ذہن و دماغ میں ان کے تعلق سے بدگمانی، نفرت اور شکوک و شبہات کے کانٹے بودیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زاویۂ نگاہ اور فکر و عمل کا یہ انداز "گناہِ کبیرہ" میں داخل ہے اور اس "ایمانِ خالص" کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے جس کی بنیاد ہی محبت و اخوت پر رکھی گئی ہے۔ اگر دین و ایمان کی اس حقیقت تک ایسے لوگوں کی رسائی ہوتی اور وہ اس نکتہ کو سمجھتے تو وہ یقیناً اپنے اسلامی بھائیوں سے محبت کو اپنا فرض سمجھتے، ان کیلئے خلوت و جلوت

میں دعائیں کرتے، دعوتی کام میں ہاتھ بٹاتے اور خیر خواہانہ جذبات اور مخلصانہ سلوک رکھتے، سنجیدہ انداز میں خیر اور بہتر بات کی تلقین کرتے لیکن کیا کیا جائے ان کے سینے کینہ سے بھرے ہوئے ہیں، دل میں حسد اور بغض وعداوت کی آگ جل رہی ہے اور ذہن ودماغ میں شیطنت رچی ہوئی ہے، بڑے بڑے منکرات، بے حیائی، بدکاری اور خلاف شرع باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن ان کے اندر کھٹک پیدا نہیں ہوتی اور ان کے چہرے سے کرب بے چینی کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوتا۔ بے پرواہ، بے نیاز اور ہر طرح کی حس سے خالی، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں لیکن اپنے دینی وایمانی بھائیوں اور دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کی کوئی چھوٹی لغزش دیکھتے ہیں تو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، چہرے سرخ ہو جاتے ہیں اور ہر محفل میں ان کی مخالفت میں اپنی زبانیں بے لگام چھوڑ دیتے ہیں" (۱)

میں خدا کا واسطہ دے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ مصلح، نیک اور خیر خواہ لوگوں کا شیوہ ہے؟ یا شر پسندوں اور فتنہ پردازوں کا طریقہ کار ہے؟ جب کہ آپ کا پروردگار آپ سے یہ کہتا ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ" (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ فتنہ پردازوں کے کردار کو نہیں سدھارتا۔

---

(۱) الولاء والبراء ص: ۳۲۔

(۲) [illegible]

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی

اگر کوئی شخص اپنا انتساب مہاجرین کی اس جماعت کی طرف کرے جس کے بارے میں قرآن میں کہا گیا:

اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ (حشر: ۸)

جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے (ظلماً) جدا کر دیئے گئے وہ اللہ کا فضل (یعنی جنت) اور رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

یا اپنا شخصی انتساب جماعتِ انصار کی طرف کرے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِیْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ۔ (حشر: ۹)

اور وہ مؤمن جو دارالاسلام (مدینہ) میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں۔

تو ایسا شخص خدا کی نگاہ میں محبوب اور پسندیدہ ہے کہ یہ القاب اور نسبتیں نہایت بلند و بالا اور باعظمت و باکرامت ہیں۔ دین کی نصرت اور راہِ خدا

میں مجاہدہ اور جہاد میں مسابقت کرنے والی ہر جماعت کو خدا نے یہ نسبت بخشی ہے لیکن جب ہر جماعت اپنے اپنے نشانِ امتیاز اور لیبل کی بنیاد پر ایک دوسرے کو مخاطب کرتی ہے تو اس میں جاہلی عصبیت کی بو محسوس ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک انصاری اور مہاجر کے مابین کسی بات پر لڑائی ہو گئی۔ مہاجر نے مدد کے لئے اپنے مہاجر ساتھیوں کو یَا للمھاجرین؟ اور انصاری نے اپنے ساتھیوں کو یَا للانصار کے الفاظ سے پکارا (یہ دونوں جملے عربی زبان میں استغاثہ یعنی فریاد رسی کے لئے استعمال ہوتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وہیں تشریف فرما تھے، یہ سن کر آپؐ نے جوشِ غضب میں فرمایا: "أبدعوی الجاھلیۃ وانا بین اظھرکم؟ (۱) میری موجودگی میں تم لوگ جاہلیت کا نعرہ لگاتے ہو؟ ——— گویا اس واقعہ نے آپؐ کو سخت ناراض کیا اور بروقت سرزنش فرمائی تاکہ آئندہ اس قسم کے جملے اور نعرے سے مسلمان اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شریعت، مہذب اور شریفانہ القاب بہر طور پسند کرتی ہے اور ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے لیکن جب ان القاب پر عصبیت کی گہری چھاپ پڑ جاتی ہے اور وہ القاب یا الفاظِ خطاب دین کے وسیع تر دائرہ کو محدود تصورات کے دائرہ میں سمیٹتے ہیں تو یہ ایک بڑی غلطی ہے، بلکہ شخصی یا جماعتی انتساب میں اصل یہ ہے کہ اس دین اسلام کی طرف انتساب ہو جو کسی فرد یا جماعت کی عقلی حاکمیت سے ماوراء ہے ——— نیز اس دین میں ہر اختلاف کی یکسوئی کا مرکز خدا اور اس کا رسول اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا قائد و امام ہے۔

---

(۱) بخاری (فتح الباری ۱۰/۴۷۲ و ۴۷۷)، مسلم شریف ۲۵۸۴۔

اسلام، اصلاح و دعوت اور خیر و فلاح پر مبنی مقاصد کا حامل مذہب ہے۔ اس لیئے اس کو فکر کے محدود اور تنگ زاویوں میں محصور کرنا اور لوگوں کو اسی محدود فکر کی قبولیت پر آمادہ کرنا، نیز ان محدود فکری زاویوں ہی کو دوستی و دشمنی کا معیار بنانا اور تزکیۂ نفس میں اسی کو بنیاد بنانا کسی طرح بھی روا اور مناسب نہیں ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

خدائی قانون کی رُو سے کسی بے سند ناموں اور نسبتوں کے ذریعہ امت کے درمیان تفرقہ بازی درست نہیں، مثلاً کسی کو شکیلی یا قرفندی وغیرہ کہہ کر پکارا جائے۔ کیونکہ اس طرح کے تمام نام باطل ہیں، کتاب و سنت اور سلف کے اقوال و ملفوظات میں کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس لیئے جب کسی مسلمان کو اس طرح کے بے بنیاد القاب سے پکارا جائے تو اسے یہ ضرور کہنا چاہیئے کہ میں نہ شکیلی ہوں، نہ قرفندی اور نہ کوئی اور انتساب رکھتا ہوں، بس میرا تشخص یہی ہے کہ میں مسلمان ہوں، قرآن و حدیث کا تابع ہوں۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا، آپکا تعلق حضرت علیؓ کی ملت سے ہے یا حضرت عثمانؓ کی ملت سے؟ جواب میں انہوں نے کہا، میرا تعلق نہ حضرت علیؓ کی ملت سے ہے، نہ حضرت عثمانؓ کی ملت سے، بلکہ میں براہِ راست امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق و انتساب رکھتا ہوں۔

سلفِ صالحین اسی راہ پر گامزن رہے، ان میں سے بعض کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیوی نسبتیں اور امتیازات و تشخصات کو بنیاد بنانے والے جہنم کے راستہ کو اپنے لیئے ہموار بناتے ہیں۔ ایک بزرگ

کا یہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ مجھے اللہ نے اسلام کی ہدایت دی اور نسب پرستی اور جذبۂ انتساب سے دُور رکھا۔ یقیناً یہ دونوں نعمتیں بہت بڑی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ہمارا جو نام تجویز کیا ہے اور جسے ہمارے لئے تشخص کا معیار قرار دیا ہے وہ "مؤمنین" "مسلمین" اور "عباد اللہ" وغیرہ ہیں۔ اس لئے جو نام خدا نے ہمارے لئے تجویز کئے وہی ہمیں عزیز ہیں، کسی اور انتساب کی ہمیں ضرورت نہیں، ہاں وہ نام اور وہ انتساب جائز ہے جس کی نسبت کسی امام جیسے حنبلی، حنفی، شافعی اور مالکی یا کسی شیخ جیسے قادری، عدوی وغیرہ یا کسی قبیلہ یا شہر کی طرف ہو جیسے قیسی، یمانی، شامی، عراقی اور مصری وغیرہ، ظاہر ہے اس طرح کے انتسابات ایک دوسرے کیلئے تعارف کا ذریعہ ہیں نہ کہ تفاخر کا، کسی نسبت کو اپنے لئے تعارف اور پہچان کا ذریعہ بنانا تو جائز ہے لیکن اس کو بڑائی اور فخر کا معیار قرار دینا کسی طرح بھی روا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مختصر یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو دوستی و دشمنی کا معیار ان ظاہری تشخصات و اسمار کو ہرگز نہ بنانا چاہئے کہ خدا کے یہاں سب سے زیادہ باعزت شخص چاہے وہ کسی جماعت کا کیوں نہ ہو، وہ ہے جو صاحب تقویٰ ہو اور خدا کے اولیاء وہ ہیں جن کا سینہ ایمان و معرفت سے لبریز ہو۔ مؤمن کا دوست اور ولی خدا اور اس کا رسول اور اس کے مؤمن بندے ہیں، جس مؤمن میں بھی ایمان و تقویٰ ہے، وہ خدا کا ولی ہے چاہے وہ کسی جماعت اور گروہ سے تعلق رکھتا ہو (۱)۔

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۳/۴۱۵۔

ناواقفیت ـــــ مخالفت کی بُنیاد

"جہل" یا جہالت ایک ایسی خصلت ہے جسے انسان کا دل اور اس کی عقل نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور فطرت سلیمہ اسے ناپسند کرتی ہے کوئی بھی شخص بخوشی اس وصف کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا وہ ہے حق کی پہچان اور نقص سے کمال کی سمت عروج و ارتقاء، یہی انسانی فطرت ہے تاہم مختلف انسان اپنی طلب جستجو کے اعتبار سے اس فطری خواہش کی تکمیل میں مختلف معیار رکھتے ہیں

جہالت انسان میں دو وجہ سے پائی جاتی ہے کبھی تو کم علمی اس کا باعث ہوتی ہے اور کبھی علم نافع کا فقدان۔ ظلم اور جہل دونوں میں انسان کی گمراہی ہے اور ان دونوں میں زیادہ خطرناک اور ضرر رساں جہالت ہی ہے جو شخص جاہل ہوتا ہے وہ ظالم بھی ہوتا ہے اور اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے یا کسی دوسرے پر اپنا قہر و ظلم مسلّط کرتا ہے اور ظالم آدمی طبعی طور پر عدل و انصاف کی خدائی تعلیمات سے نابلد ہوتا ہے۔

اپنی بعض ذاتی خصوصیات اور شخصی تشخصات کے اعتبار سے لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو عالم کہلاتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو متعلم ہیں، اسی طرح کچھ ایسے بھی ہیں جو اُن کے متبعین ہیں، وہ حق و باطل اور افضل و غیر افضل

میں تمیز تک نہیں رکھتے۔

اس لئے کہ ایک طرف یہ لوگ غور و فکر کی صلاحیت سے محروم اور حق کی دریافت سے عاجز ہوتے ہیں اور دوسری طرف خواہش نفس کی پیروی یا تقلید جامد کا شکار ہو کر ایسے عقیدہ کے حامل ہوتے ہیں جو سراسر سچائی اور حق کے خلاف ہوتا ہے۔ حق سے محرومی کا سبب کبھی یہ بات بھی بن جاتی ہے کہ محض چند اوراق کے مطالعہ اور دو چار باتیں سُن کر آدمی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس نے علم حاصل کر لیا ہے۔ اور حق و باطل میں امتیاز کی صلاحیت سے محرومی، قلب کی بے بصیرتی اور فطرتِ سلیمہ سے محرومی کا احساس تک نہیں ہوتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کے واضح اور روشن ہونے کے باوجود اور اُوپر کی ملمع سازی کے پیچھے حق کی رہنمائی جلوہ گر ہونے کے باوصف، محض شکوک و شبہات اور اتہامات سے متاثر ہو کر ایسا شخص حق تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ اسی غیر حقیقت پسندانہ طرزِ عمل اور غلط اندازِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے نوجوان دعوتِ اسلامی پر لکھی گئی بہت سی مفید کتابوں کے مطالعہ سے محروم رہ گئے اور مختلف باتیں بنا کر کبھی بدعت کا الزام لگا کر اور کبھی اس میں نقص بتا کر اُن کتابوں کے مطالعہ سے انہیں روکا گیا۔

سعودی عرب کے سابق مفتی شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ کا اپنے مجموعۂ فتاویٰ میں تحریر کردہ ایک عبرت انگیز قصہ سنئے، وہ لکھتے ہیں:

"ایک نجدی شخص عبدالرحمٰن البکری کا قصہ سُنا رہا ہوں، شیخ عبداللہ بن عبداللطیف آلِ شیخ وغیرہ کے یہاں وہ پہلے پڑھتے تھے، پھر انہیں یہ خیال ہوا کہ وہ عمان میں ایک مدرسہ اپنے ذاتی صرفہ سے قائم کریں جس میں وہ لوگوں کو توحید کی تعلیم

دے سکیں، چنانچہ جب ان کا سرمایہ ختم ہوا تو کسی سے کچھ رقم لے کر ہندوستان کا رُخ کیا تو چھ ماہ تقریباً ہندوستان میں لگ گئے شیخ بکری کہتے ہیں کہ میں ہندوستان میں ایک مسجد کے پڑوس میں رہتا تھا۔ مسجد میں ایک مدرس تھے، تدریس سے جب کبھی وہ فارغ ہوتے تو وہ اور تمام طلبہ مل کر شیخ محمد بن عبدالوہابؒ پر لعنت بھیجتے۔ جب وہ مسجد سے نکلتے تو میرے سامنے سے گذرتے اور مجھ سے کہتے کہ "میں عربی اچھی طرح بول لیتا ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ عربی کو اہل زبان سے سنوں" چنانچہ گفتگو ہوتی، پھر وہ میرے پاس ٹھنڈا پانی ضرور نوش کرتے،

مجھے یہ خیال ہوا کہ آخر یہ اپنے درس میں کرتے کیا ہیں جسکی وجہ سے انہیں شیخ نجدیؒ پر لعنت بھیجنی پڑتی ہے۔ شیخ بکری کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ ایک تدبیر سوچی اور انہیں دعوت دی اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی کتاب "التوحید" ہاتھ میں لیا۔ اس کا غلاف (کتاب کا ٹائیٹل اور نام وغیرہ) نکال کر اُن (مدرس صاحب) کی آمد سے پہلے ہی ایک میز پر رکھ دیا۔ جب مدرسِ مذکور حسبِ وعدہ میری دعوت پر تشریف لائے، تو میں نے کہا "اجازت ہو تو میں خربوزہ لیتے آؤں؟" چنانچہ میں گیا اور خربوزہ لے کر واپس ہوا تو دیکھا کہ وہ کتاب پڑھ رہے ہیں اور حیرت و تعجب میں اپنے سر کو حرکت بھی دے رہے ہیں، واپسی پر مجھ سے فرمایا، یہ کس کی کتاب ہے؟ اس کے جو مضامین ہیں وہ بالکل

بخاری شریف کے مضامین ہی کی طرح ہیں، پھر خود ہی کہنے لگے یہ تو بخاری شریف ہی ہے، میں نے کہا، مجھے معلوم نہیں کونسی کتاب ہے، پھر میں نے اُن سے کہا، شیخ غزوی سے چل کر اس کتاب کے بارے میں معلومات حاصل کریں؟ شیخ غزوی ایک کتب خانہ کے مالک تھے، چنانچہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے شیخ غزوی سے کہا کہ میرے پاس ایک کتاب کے یہ کچھ اوراق ہیں، شیخ بکری مجھ سے دریافت کر رہے ہیں کہ یہ کتاب کس مصنف کی ہے؟ چوں کہ مجھے اس کا علم نہیں اس لئے آپ بتا دیجئے! شیخ غزوی اس پورے واقعہ کو خوب سمجھ رہے تھے اس لئے انہوں نے خادم کو آواز دے کر کتاب "مجموعۃ التوحید" منگوائی اور میری کتاب کے اوراق و مضامین کا اس کتاب کے مضامین سے تقابل کر کے بتایا کہ یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی کتاب ہے، یہ کہنا ہی تھا کہ بس! وہ ہندوستانی عالم (مدرس) سخت ناراض ہو گئے اور بہ آوازِ بلند کہنے لگے "محمد بن عبدالوہاب کافر کی یہ کتاب ہے؟"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے ہم اور وہ سب خاموش ہو گئے، ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا، اِنَّا لِلّٰہِ وانا الیہ راجعون پڑھا، پھر انہوں نے افسوس و حیرت کے ملے جُلے انداز کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اچھا! یہ کتاب شیخ محمد بن عبدالوہاب کی ہے! ہم نے اُن پر بہت ظلم کیا"۔ جب انہیں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ کتاب شیخ ہی کی ہے اور اس کتاب سے ان کی عظمت دل میں بیٹھ گئی تو اس دن سے وہ اور اُن کے تمام شاگرد و طلبہ شیخ محمدؒ ابن عبدالوہاب کے لئے دُعائیں کرتے تھے، ہندوستان میں اُن کے

شاگرد پھیل گئے جب بھی وہ لوگ درس و تدریس سے فارغ ہوتے ہیں
تو شیخ کے لئے دعا ضرور کرتے ہیں۔" (۱)

اس واقعہ میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ تعصب و جہالت دعوتِ دین کی کتابوں اور داعیوں کے خیر کثیر پر کس طرح تاریکی کے پردے ڈال دیتی ہے، اور کس طرح انسان جہالت کا دشمن ہے۔ پس ہمیں بھی یہ چاہیئے کہ جنہیں ہم بدعتی سمجھتے ہیں، تحقیقِ حال کے بعد اُن سے استفادہ کی راہیں ہموار کریں۔

---

(۱) الفتاویٰ للشیخ محمد بن ابراھیم آل شیخ ۱/۷۵۔

باہمی تعاون کے ساتھ تقسیمِ کار

امّت کے مسائل اور مصالح بے شمار ہیں، باوجودیکہ متعدد کوششیں ہو رہی ہیں اور صلاحیتوں کو مربوط کیا جا رہا ہے پھر بھی وہ امّت کے ان مصالح اور مسائل کے حل سے قاصر ہیں جو علماء کی ناکافی صلاحیت، مسلمانوں کی دین سے ناآگہی اور حکام کی غفلت و سستی کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

اس وقت ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں ایسے بہت سے اہم مسائل سے ہم دوچار ہیں جن کے مقابلہ کے لئے ہمیں سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہم آہنگ و ہم آواز ہونے اور اختلافات کی خلیج کو پاٹتے ہوئے نقطہ ہائے اتفاق تلاش کرنے کی ضرورت ہے، حالات کی سنگینی اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک سنجیدگی کے ساتھ اپنی صلاحیت کو تولے، اور اپنی صلاحیت کار کے حدود میں خود کو محدود رکھے، نیز ہر جماعت اپنے دائرۂ کار کو مسلمانوں کی کسی ایک یا متعدد مصلحتوں کی تکمیل میں وقف کردے، اس لئے کہ ہم ابھی تک مسلمانوں کے اتحاد کے خواب ہی دیکھ رہے ہیں لیکن فی الواقع ایک مخصوص تعداد کو چھوڑ کر مسلمانوں میں انتشار کی کیفیت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہمارا اختلاف رحمت کا باعث ہو نہ کہ وہ خدا کا عذاب بن جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ہمارا اختلاف

محض اس بات پر مبنی ہو کہ مختلف لوگ مختلف میدانوں میں کام کریں نہ یہ کہ ان مختلف کاموں میں باہم تضاد اور تناقض کی کیفیت ہو، کام کی نوعیت میں اختلاف کے باوجود باہمی تعاون بیعتِ اسلامی نے ہم پر واجب اور ضروری قرار دیا ہے۔

مثال کے طور پر ایک تحریک یا جماعت، قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمانوں کے عقائد کی درستگی و اصلاح اور شرک و خرافات سے ان کے عقائد کے تحفظ کا کام کرے تو دوسری مسلمانوں کے اعمال کی اصلاح، بدعات و خرافات سے انکی عبادات کی پاکیزگی اور دینی تفہیم و تربیت کا فریضہ انجام دے، تیسری جماعت اسلام کے نظامہائے زندگی کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرے اور اس کو عملی بنیادوں پر زندگی سے مربوط رکھنے کی کوشش کرتی رہے۔ مثلاً اقتصادی نظام کا عملی خاکہ پیش کرے، چوتھی تنظیم وہ ہو جو غیر مسلموں کے درمیان دعوتِ اسلامی کے فروغ و اشاعت کے محاذ پر اپنی ذمہ داری انجام دے رہی ہو، پانچویں جماعت مسلمانوں کی سماجی اصلاح اور اسلامی گھرانوں کی تربیت اور بے حیائی و بے پردگی کے مقابلہ کے کام پر متوجہ رہے، چھٹی جماعت کا مشن یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کا کام انجام دے، انتخابات میں حصہ لے اور پوری بیدار مغزی کے ساتھ ملکی سیاست، سیکولرزم اور مغربی نظامِ سیاست پر نگاہ رکھے، ساتویں تنظیم وہ ہو جو اصلاحِ نفس، اصلاحِ فکر اور نئی نسل کی تربیت و نگہداشت کا چارج سنبھالے۔ اسی طرح ایک اور تنظیم یا جماعت وہ ہو جو وسائل و امکانات اور حالات کے رُخ کے مطابق ان تمام میدانوں اور محاذوں یا کسی ایک محاذ پر اپنا عملی تعاون پیش کرتی رہے۔

اس طرح مسلمانوں کی تمام جماعتیں اور تنظیمیں اپنے اپنے دائرہ عمل کے اعتبار سے مختلف و متنوع ہوں، امت کے مصالح و مفادات کی تکمیل کے

عزم، فلاحی و رفاہی کاموں میں تعاون و اشتراک کے جذبہ اور دین کی بنیاد پر اخوت و محبت کے سایہ میں تمام جماعتیں اپنا اپنا رول ادا کریں، ہر جماعت دوسرے کے بارے میں حسنِ ظن رکھے۔ اختلافی مسائل میں چشم پوشی اور تسامح سے کام لیا جائے اور ان اساسی اور بنیادی باتوں پر ہم اپنی اجتماعیت کا بھرپور مظاہرہ کریں جن سے ایک مسلمان "مسلمان" بنتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِینَ	اللہ تو ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو
یُقَاتِلُونَ فِی سَبِیلِہٖ صَفًّا کَأَنَّہُم	اس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں
بُنیَانٌ مَّرصُوص ۔ (الصف: ۴)	کہ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں،

نزولِ رحمت میں رکاوٹ

مسلمانوں کو اپنی صفِ وحدت میں پیدا ہونے والے خلل و نقص، کوتاہیوں اور کمزوریوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے اور اسے مضبوط و مستحکم اور پائیدار بنانے کے لئے مناسب اقدامات کرتے رہنے چاہئیں تاکہ وہ پوری ثابت قدمی، حکمت و دانائی اور خلوص کی پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کی وحدت اور فلاح و بہبودی کے لئے اپنی ذمہ داری سرانجام دے سکیں۔ اس سلسلہ میں تمام مسلمان قائدین و زعماء کی، مسلمانوں کے مسائل کے حل سے دلچسپی، ان کی جان و مال اور ان کی امیدوں کے تحفظ کے لئے قلبی تعلق و وابستگی کی سخت ضرورت ہے۔ ایسی ہی وحدت و اجتماعیت پر اس اللہ کی نصرت و حفاظت کا وعدہ ہے جو دل و نگاہ کے بھیدوں سے خوب آشنا ہے ——— مسلمان اگر یہ محسوس کریں کہ انکی صف میں کچھ ایسے لوگ شامل ہو گئے ہیں جن کے دل میں کھوٹ ہے۔ ناپاک خفیہ عزائم رکھتے ہیں، جن کا ماضی مجروح اور داغدار اور حال مشکوک و پُرغبار ہے تو انہیں اپنی صف سے نکال دینا چاہیئے تاکہ وہ توفیقِ الٰہی کے نزول میں رکاوٹ اور رحمتِ خداوندی کے ظہور میں حائل نہ ہوں۔ کیونکہ ایسے ہی لوگ اہل ایمان اور مسلمانوں کی ہم آہنگی و اجتماعیت کی راہ میں "خارِ راہ" ثابت ہوتے ہیں۔

لوخرجوا فیکم مازادوکم	اگر یہ لوگ تمہارے شامل ہو کر چلتے تو تمہارے
الاخبالاً ولأوضعوا خلٰلکم	درمیان فساد ہی بڑھاتے یعنی تمہارے درمیان

یبغونکم الفتنۃ وفیکم سمّٰعون	فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے
لھم واللہ علیم بالظالمین۔	اور تمہارے درمیان ان کے جاسوس (اب بھی)
(توبہ : ۴۷)	موجود ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے

یہ وہ لوگ ہیں جو فراست ایمانی سے سرفراز نگاہوں سے اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتے۔

ولو نشاء لأریناکھم فلعرفتھم	اور اگر ہم چاہتے تو ہم آپ ان کا پورا پتہ بتا دیتے
بسیماھم ولتعرفنھم فی لحن	تو آپ انہیں ان کے حلیہ سے پہچان لیتے اور آپ
القول۔ (محمّد : ۳۰)	انہیں (ان کے) طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔

ہمیں اپنے دشمنوں سے باخبر ہونا ضروری ہے تاکہ ہم ان سے احتیاط برتیں اور اپنے مخلص دوستوں تک رسائی حاصل کریں۔ تاکہ ہم غیر مخلص کے مقابلہ مخلص کو پہچان سکیں۔ اس لیے کہ یہ محض ظاہر کی بنیاد پر فریب خوردگی اور خود سپردگی ہے کہ کوئی بھی شخص جو بہ ظاہر ہماری فکر و غرض سے اتفاق رکھتا ہو اسے دوست سمجھا جائے خواہ وہ ظاہری دوستی کے پس پردہ کتنی ہی گہری عداوت و نفرت رکھتا ہو۔ اور جو بظاہر ہماری فکر و رائے سے اختلاف رکھتا ہو اسے دشمن سمجھا جائے، خواہ وہ اپنے ظاہری اختلاف کے پس پردہ کتنی ہی محبت رکھتا ہو ——— دوست و دشمن میں فرق و امتیاز کے لئے دور رس نگاہ، عمیق فکر اور صحیح قوتِ فیصلہ مطلوب ہے۔ ایسے مواقع پر محض ظاہر کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی بجائے حقائق کے اجالوں میں کسی واقعی نتیجہ تک پہنچنا چاہیے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ہم میں کچھ ایسے باخبر اور ماہر ہوں جو دوست و دشمن، خیر خواہ و ہمدرد اور شر پسند دھوکہ بازوں کے چہروں کی لکیروں کو پڑھ سکیں اور صحیح حکمتِ عملی اختیار کر سکیں۔ واللہ یتولی المؤمنین بحفظہ ورعایتہ۔ ❁❁❁❁

ثریّا سے زمیں پہ آسماں نے ہم کو دے مارا

دعوتِ اسلامی کی راہ میں بنیادی اور اصل نقطۂ انحراف، دَر اصل اہلِ دعوت کو دیئے گئے وہ اصول ہیں جسے انہوں نے یکسر فراموش کر دیا ہے، اصولِ دعوت کی فراموشی اور داعیانہ کردار سے غفلت وتساہل ہی درحقیقت ہر قسم کے انحراف اور کج روی کا باعث ہے اور اسی کے سبب، مختلف مذاہب اور جماعتوں کے درمیان "اختلاف" کی بنیاد پڑی، جس کا سلسلہ اَب تک جاری ہے، اور قیامت تک جاری رہے گا۔ خدا کی تعلیمات اور اس کی پند وموعظت کے ایک بڑے حصّہ سے ہماری غفلت اور اللہ کے عہد وپیمان کی کھلی خلاف ورزی کا یہ نتیجہ اور ثمرہ ہے، اور آخرت میں بھی اس کا بدلہ دیا جائے گا، جہاں علیم وخبیر ذات باری کے سامنے ہمارا نامۂ اعمال، ہمارے عمل کی شہادت دے گا، ذرا آپ ہی غور کیجئے کہ مسلمانوں کی آپسی لڑائی میں مسلمانوں کا کتنا خون بہا؟ عقیدہ کے سلسلہ میں بحث ومناظرہ ہو یا سیاسی ودینی حاکمیت کے اختلاف ہوں ——— مسلمانوں کی آپسی لڑائی کے نتیجہ میں جتنا مسلمانوں کا خون بہا، شاید پوری اسلامی تاریخ میں غیر مسلموں کے ساتھ ان کی لڑائیوں میں اتنا خون نہ بہا ہوگا۔

آخر یہ عداوتیں اور اختلافات کب ختم ہوں گے؟ جنگ وجدل اور

کینہ وعداوت کی انگیٹھیاں آخر کب بجھیں گی؟ حدیث میں فرمایا گیا:

لتتبعن سُنن الذین من	ایک ایک بالشت اور ایک ایک قدم تم لوگ
قبلکم شبراً بشبر وذراعاً بذراع[1]۔	اپنے پہلے لوگوں کی اتباع کرو گے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بارے میں فرمایا:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ	اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ	لیا تھا اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر
اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ	کیے تھے اور اللہ نے ان سے یہ بھی کہدیا
اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ	تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تو اگر نماز
وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ	کے پابند رہو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے
بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ	اور میرے پیمبروں پر ایمان لاتے رہو گے
اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	اور ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو
لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ	اچھے طور پر قرض دیتے رہو گے تو میں
وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	تم سے تمہارے گناہ ضرور دور کردونگا
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ	اور ضرور تمہیں بہشت کے باغوں میں داخل
بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ	کردوں گا جن کے نیچے نہریں پڑی بہہ
سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ فَبِمَا نَقْضِهِمْ	رہی ہوں گی، اور جو کوئی تم میں سے اس
مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا	کے بعد بھی کفر کرے گا تو بے شک اس
قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ	نے راہِ راست ضائع کردی۔ غرض
الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا	ان کی پیمان شکنی کی بناء پر ہم نے انہیں
حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا	رحمت سے دور کردیا اور ہم نے اُنکے

(۱) بخاری (فتح: ۱۷/۶۴)

تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاصْفَحْ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝
وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا
نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ
فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ
فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ
الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ط
وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا
كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

(المائدۃ آیت ۱۲ تا ۱۴)

دلوں کو سخت کر دیا وہ کلام کو اس کے موقع
محل سے بدل دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں
نصیحت کی گئی تھی اس کا بڑا حصہ بھلا بیٹھے
ہیں اور ان میں سے بجز معدودے چند
کے آپ کو ان کی خیانت کی اطلاع ہوتی
رہتی ہے۔ سو آپ ان کو معاف کر دیجئے
اور ان سے درگذر کیجئے، بیشک اللہ
نیک کاروں کو پسند کرتا ہے اور جو کہتے ہیں
کہ ہم نصرانی ہیں ہم نے ان سے بھی عہد
لیا تھا سو جو کچھ انہیں نصیحت کی گئی اس کا
بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے تو ہم نے ان میں باہم
بغض اور عداوت قیامت تک کیلئے ڈال
دیا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اللہ انہیں
عنقریب وہ جتلا دے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "انی معکم" (میں تمہارے ساتھ ہوں) یہ بات کوئی بے سوچے سمجھے اور بے تکے انداز میں یا کسی کی دلداری میں نہیں کہی۔ اور نہ کسی ایسی شخصیت کے اعزاز میں کہی جو اسباب امکانات سے تہی دست ہو بلکہ یہ ایک "خدائی عہد" ہے جس کی بنیاد ان آیات میں مذکور شرائط کی تکمیل ہے اور اسی وقت اس جزاء کا تحقق ممکن ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"امت کے علماء و مشائخ، امراء اور اصحاب رسوخ کے درمیان جو

تفرقہ وانتشار پیدا ہوا ہے وہی دَراصل اس امت پر دشمن طاقتوں کے تسلط کا سبب ہے، کیوں کہ امّت نے اپنے اس عمل (تفرقہ وانتشار) کے ذریعہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، پس جب بھی امت احکامِ خداوندی سے اعراض کرے گی، عداوت وبغض اور فساد کی آگ ان میں بھڑکے گی۔ پھر اس کے نتیجہ میں جب پوری قوم انتشار کا شکار ہوئی تو فساد وھلاکت نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا، اور جب پوری قوم متحد ومنظم اور باھم مربوط رہی تو صلاح وفلاح اور شوکت واقتدار کے دَروازے ان پر وا ہو گئے ——— یقیناً اجتماعیت باعثِ رحمت ہے اور انتشار باعثِ ذلت" (۱)۔

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۳/۴۲۲۔

ایمانی رشتہ کی مضبوطی

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے فریقِ مخالف کے تئیں کسی بات پر شاکی ہوتا ہے جو واقعی اس پر ظلم کر رہا ہوتا ہے، کبھی دونوں ایک دوسرے کے حق میں ظالم و مظلوم اور باہم گلہ سنج ہوتے ہیں اور بسا اوقات صورتحال یہ ہوتی ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی نہ ظالم ہوتا ہے نہ مظلوم، لیکن کسی شبہ، غلط فہمی یا محض غلط نتیجہ آخذ کرنے کی بنیاد پر دونوں کے درمیان مغالطہ اور سوءِ ظن کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ اور تفرقہ و اختلاف کے عوامل و اسباب اپنے آپ مستحکم ہوتے جاتے ہیں ——— اب وہ شخص جو مظلوم کی مدد کرنا چاہتا ہے یا ظالم کو ظلم سے باز رکھ کر اس کی مدد کرنا چاہتا ہے، اس پر یہ بنیادی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اُن میں سے کسی فرد کے، دوسرے کے خلاف، محض دعویٰ کی بنیاد پر فیصلہ نہ کرے بلکہ دوسرے فریق سے بھی حالات کی تفتیش کرے اور ہر دعویٰ پر غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

کسی مؤمن و مسلمان شخص پر اگر واقعی کسی مسلمان نے ظلم کیا تو اس ظلم کے باوجود آپس کا ایمانی رشتہ باقی رہتا ہے، اسلامی اخوت باقی رہتی ہے اس لئے ہر قسم کے اختلافات اور ہر طرح کے ظلم و تعدی کے باوجود اپنا ایمانی رشتہ باقی رکھنا چاہیئے اس لئے کہ ظالم کا ظلم اور کسی مفسد کا شر و فساد،

اسلامی رشتۂ تعلق کو متزلزل نہیں کرسکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما۔	اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کرنے لگیں تو انکے درمیان اصلاح کردو

اسی طرح رب تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کہ

انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم۔ (الحجرات: ۹ — ۱۰)	یقیناً مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کردیا کرو۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے سب کو بھائی بھائی بنایا ہے، آپس میں صلح و اصلاح کی ہدایت دی ہے اور ہر نوعیت کے اختلاف و نزاع کے باوجود مسلمانوں کی نسبت جو "ایمان" ہی کی طرف کی گئی ہے۔ اس میں چشم بصیرت کے لئے عبرت کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ ان دونوں آیتوں کی اصل روح پر ہر مسلمان کو غور کرنا چاہیئے کہ اس میں اخوتِ ایمانی کے تانے بانے کس قدر ملتے جلتے ہیں، اکثر و بیشتر مؤمن سے لڑائی اور اختلاف اور اس سے رشتۂ اخوت و بھائی چارگی میں دوسری قوموں کو اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ مؤمن سے ایمانی رشتہ اور دوستی بہرطور رکھنی واجب ہے، خواہ اس نے کتنی ہی زیادتی کی ہو، اسی طرح کافر سے بے تعلقی ضروری ہے، خواہ اس نے کتنا ہی احسان و اکرام کیا ہو۔ کیوں کہ اللہ اپنے بندۂ مؤمن کو دوست رکھتا ہے ——— محبت و اکرام اور نوازش و احترام، خدا کے اولیاء اور مقرب بندوں کے لئے ہے اور بغض و اہانت خدا کے دشمنوں کے لئے ہے۔

یہ بھی روا نہیں ہے کہ ظلم کا جواب ظلم سے دیا جائے، جیسے ترکِ تعلق

ہی ہے کہ یہ بھی ایک طرح کی سزا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے زمرہ میں ہے، اگر اس کا مقصد محض اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کی سربلندی ہو، محض تقاضۂ نفس وطبیعت کے تحت تین دن سے زیادہ کسی سے گفتگو کا ترک کرنا اور بے تعلقی برتنا جائز نہیں۔

صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

"کسی مسلمان کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق کرے۔ دونوں کا آمنا سامنا ہو اور ہر ایک ملاقات سے ہچکچاتا اور باز رہتا ہو تو اس وقت ان دونوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے"

حدیث مذکور میں تین دن سے زیادہ ترک تعلق کی اجازت نہیں دی گئی اور اسے ایمانی اخوت کے تقاضوں کے خلاف عمل قرار دیا گیا۔

صحیح مسلم میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

"جنت کے دروازے ہر پیر اور جمعرات کے دن کھول دیئے جاتے ہیں اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے والے ہر بندۂ مؤمن کی مغفرت کر دی جاتی ہے سوائے اس شخص کے جو اپنے مؤمن بھائی سے بغض وکینہ رکھتا ہو، اس وقت کہا جائیگا کہ ان دونوں کو مہلت دو یہاں تک کہ یہ آپس میں صلح کرلیں" (۱)۔

اللہ تعالیٰ سچے، مؤمن اور الفت ومحبت رکھنے والے دلوں کو خیر وصلاح کی توفیق دیتے ہیں "ان یریدا اصلاحاً یوفق اللہ بینھما"۔ (النساء: ۳۵)

اس طرح اللہ تعالیٰ دونوں فریق کے ربط وتعلق مضبوط بناتے ہیں اور ہمیشہ خیر سگالی کا ماحول عطا فرماتے ہیں ——— تاہم دونوں فریق میں افضلیت کا اعزاز اسی کو حاصل ہوگا جو سلام میں پہل کرے۔

---

(۱) بخاری (فتح ۱۳/۱۰۷-۱۰۸) مسلم ۲۵۶۰۔

اقدام سے پہلے تحقیق

انسانی اعضاء میں طویل سزا و قید کا مستحق اگر کوئی عضو ہے تو وہ "زبان" ہے۔ اس لئے کہ عام طور پر انسان اسی کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہوتا ہے، زبان کی تخلیق و پیداوری کا عمل ہر دم جاری رہتا ہے۔ جہنم میں جو لوگ اپنے چہروں کے بل ڈالے جائیں گے، ان میں وہ بھی ہوں گے جو محض اپنی چرب زبانی کے سبب ڈالے گئے۔ اسی لئے اہل جہنم جب جہنم میں پہنچ جائیں گے تو وہ اپنی زبان کے جرم ہی پر کفِ افسوس ملتے دکھائی دیں گے، وہ کہیں گے:

وکنا نخوض مع الخائضین — اور مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ

(المدثر: ۴۵) — ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے۔

قیامت کے دن سب سے بڑا گناہ اور جرم ان لوگوں کا ہوگا جو دنیا میں باطل کی ہاں میں ہاں ملاتے اور محض گمان پر باتیں گھڑنے میں پیش پیش رہتے تھے ——— پس زبان بہت بڑی امانت ہے۔

ایسی بھاری امانت جس کی عظمت اور نزاکت کے سبب انسانی ضمیر و وجدان کانپ اٹھتا ہے۔ جب بھی زبان کوئی بات کہے یا واقعہ بیان کرے یا کسی شخص پر کوئی حکم لگائے یا کسی واقعہ میں رائے زنی کرے اس کی نزاکت کا خیال ضرور رہنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نصیحت ملاحظہ فرمائیے:

ایاکم والظنّ فانه اکذب الحدیث (۱)

تم خود کو بدگمانی سے بچاؤ اس لئے کہ بدگمانی کی بات سب سے زیادہ جھوٹی ہوتی ہے

ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:

بئس مطیة الرجل زعموا (۲)

آدمی کی بُری سواری بے بنیاد ظن وگمان ہے

ان افری الفری ان یری الرجل عینیه مالم ترَیا۔ (۳)

بدترین جھوٹ یہ ہے کہ آدمی بن دیکھی باتوں کو چشم دید باتیں کہہ کر بیان کرے۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

کفیٰ بالمرء کذباً اَن یحدث بکل ماسمع (۴)

آدمی کے جھوٹا ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات نقل کرے۔

اصلاً مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیئے اور حسنِ ظن سے کام لینا چاہیئے سوائے اس کے کہ اس کے خلاف کوئی یقینی ثبوت موجود ہو۔ غرض تحقیق کے بغیر کوئی بدگمانی نہیں رکھی جائے۔

ان جاءکم فاسق بنبأٍ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجهالةٍ فتصبحوا علیٰ مافعلتم نادمین. (الحجرات: ۶)

اگر کوئی فاسق آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تم تحقیق کرلیا کرو، ایسا نہ ہو کہ کہیں تم نادانی سے کسی قوم کو ضرر پہنچادو اور پھر اپنے کئے پر پچھتاؤ۔

اپنی زبان کو جہنم میں گرنے سے بچائیے اور خدارا بندوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے سُراغ اور تفتیش کے پیچھے پڑنے سے اپنی زبان کی حفاظت

---

(۱) بخاری (فتح ۱۳/۹۵)
(۲) صحیح الجامع الصغیر ۲۸۴۳۔
(۳) بخاری (فتح ۱۶/ ۸۹ ـ ۹۰)
(۴) مسلم ۵۔

کیجیے۔ بعض صحابۂ کرام کے درمیان ہوئے کچھ اختلافات کی بابت بعض علماء سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا: "اللہ نے ہمارے ہاتھ صحابہؓ کے خون سے پاک صاف رکھے ہیں، ہم اس پر اظہار رائے کر کے اپنی زبانوں کو خونِ صحابہ سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے باہمی اختلاف ایسے ہی ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السّلام اور ان کے بھائیوں کے تھے کہ:

لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین۔ (یوسف: ۹۲)

نہیں! آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"اس کا مشاہدہ تو صحابہ نے ہی کیا، ہم تو اس وقت تھے ہی نہیں اس سلسلہ میں صحیح علم ان ہی کے پاس ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں کوئی معلومات نہیں ——— جس بات پر ان حضرات نے اتفاق کیا ہم نے اُن میں اُن کی پیروی کی۔ اور جن میں اختلاف رائے ہوا ہمارا کام اس میں خاموشی اختیار کرنا ہے۔"

ہمیں بھی اس معاملہ میں حضرت حسن بصریؒ ہی کا کردار ادا کرنا چاہیے اسی میں انشاء اللہ خیر و نجات ہے۔

داعی کا حقیقی کردار

مخلص و محترم قارئین ——————!

ہم جس دعوت اور پیغام کے حامل ہیں، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خدا پرستانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے، وہ اسلام کی دعوت اور پیغمبر اسلام کی میراث ہے۔ جس سے بڑھ کر کوئی دعوت اور کوئی دین قابلِ عظمت اور لائقِ تقدیس نہیں، خدا کے نزدیک اور دعوت کا کام کرنے والوں کی نگاہ میں وہ کسی جماعتی یا شخصی مفاد پرستی اور سیاسی اداکاری کا وسیلہ بننے کے امکانات سے بالاتر ہے، اس لئے اہلِ دعوت پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دعوتِ اسلامی کو ہر طرح کی انحطاط پذیر قدروں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں، ہماری جمعیت و اجتماعیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم جماعتی سطح پر مقابلہ آرائی کے لئے میدان میں اتر آئیں۔ یا ہم مختلف جماعتوں اور تحریکوں کے خلاف محاذ آرائی کے لئے قلعہ بند ہو جائیں، بلکہ ہم اس اصلاحی تحریک و دعوت کے حاملین ہیں جس کی بنیاد اسلام کی روشن تعلیمات پر ہے اور جسے اس بات کا بھرپور یقین ہے کہ اس کے دعوتی اثر سے تمام لوگوں کے قلوب اور تمام تحریکیں اور جماعتیں پوری فراخ قلبی کے ساتھ اس کے لئے راستہ ہموار کریں گی۔

آبِ زر سے لکھنے کے قابل اس سنہری اور قیمتی اصول پر ہمارا اعتماد

ایقان ہے کہ" ہم متفقہ مسائل میں تعاون کی راہیں نکالیں گے اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کو معذور سمجھیں گے"۔

اور اگر کچھ تحریکیں یا جماعتیں ہمارے مقابلہ ہی پر اُتر آئیں تو ہمارا سلوک اور طرزِ عمل قرآن پاک کی اس آیت کی عملی تفسیر سے عبارت ہوگا۔

ادفع بالّتی ھی احسن فاذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولی حمیم (حم السجدة : ۳۴)	آپ نیکی سے بدی کو ٹال دیجئے تو پھر یہ ہوگا کہ جس شخص میں اور آپ میں عداوت ہے وہ ایسا ہو جائیگا جیسا کوئی ولی دوست
واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه وقالوا لنا اعمالنا ولكم اعمالكم سلام علیكم۔ (القصص : ۵۵)	اور جب کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اسے ٹال جاتے ہیں اور کہدیتے ہیں کہ ہمارا عمل ہمارے لئے اور تمہارا عمل تمہارے لئے تم پر سلام ہو۔

یہ قرآنی ادب ہے جس کی پابندی ہم پر ضروری ہے۔ نیکی کو بدی پر مقدم رکھیں اور بحث و مباحثہ سے پہلے دلیل و برہان پیش کریں، بنی آدم کا بہتر فرد بننے کی کوشش کریں۔

لئن بسطتّ الیّ یدك لتقتلنی ما انا بباسط یدی الیك لأقتلك انّی اخاف اللّٰه ربّ العالمین۔ (مائدۃ : ۲۸)	اگر تو اپنا ہاتھ مجھ پر اٹھائیگا کہ مجھے قتل کر ڈالے تو میں جب بھی اپنا ہاتھ تجھ پر اٹھانیکا نہیں کہ تجھے قتل کر ڈالوں کیوں کہ میں تو اللہ پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں۔

عذر خواہی اور اعتذار کو تہمت پر اور حسن تاویل کو سوء ظن پر مقدم رکھیں،

لولا اذ سمعتموه ظنّ المؤمنون	جب تم لوگوں نے یہ افواہ سنی تھی تو کیوں

وَالمؤمنٰتُ بانفسھم خیراً وقالوا ھٰذا افکٌ مُّبین ٥ (نور: ۱۲)

نہ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنوں کے حق میں نیک گمان کیا اور یہ کیوں نہ کہدیا کہ یہ تو صریح طوفان بندی ہے۔

یعظکم اللہ اَنْ تعودوا لمثلہٖ ابداً ان کنتم مؤمنین ٥ (نور: ۱۷)

اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر اس قسم کی حرکت کبھی نہ کرنا اگر تم ایمان والے ہو۔

دعوت کی اس راہ میں ہم اپنے اعصاب اور دل و دماغ کو مکمل قابو میں رکھیں اور اس شخص سے مباحثہ و بحث کرنے سے اپنے دامن کو بچائیں جو اپنے نفرت دلانے والے الفاظ، سخت قسم کی بات چیت اور جارحانہ گفتگو سے ہمیں مشتعل کرنے کی کوشش کرے اس میدان سے جہاں تک ہوسکے راہِ فرار اختیار کریں کہ اس میدان سے فرار ہی دراصل داعی کی بنیادی کامیابی ہے اسلئے کہ اس دنیا میں شیطان کی دسیسہ کاری اور دغابازی اور شر و سور کے خطرات کے مقابلہ میں اپنی شکست تسلیم کرنا ہی بڑی بات ہے۔ اور اس طرح یہ شکست و ہزیمت حقیقت میں شکست نہیں بلکہ بغیر کسی جنگ و جدال کے عین فتحیابی ہے۔

واذا مرّوا باللّغو مرّوا کراماً۔ (الفرقان: ۷۲) لغو باتوں سے شریفانہ گزر جاتے ہیں۔

اس دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو شر سے اپنا دامن بچا سکے، سب ہی "شر" کے شکار ہیں، تاہم خیر کی توفیق پانے والے بہت کم ہیں۔ آپ کوشش کیجئے کہ خیر کی توفیق پانے والے بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے۔ دلوں میں اُلفت پیدا فرمائے اور خیر پر ہم سب کو جمع کرے۔

غلطی اور لغزش — کچھ سوچنے کی باتیں

امتِ مسلمہ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہر مسلمان کی یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ دنیا میں حق کو غلبہ حاصل ہو اور باطل، ناکامی اور شکست و ریخت سے دوچار ہو، تمام مسلمان دین حق کا پورا پورا علم رکھیں، اپنی کتاب شریعت سے بہرطور آگاہ ہوں، حق کی تائید و حمایت کرتے رہیں، خواہ وہ حق بات اپنی ذاتی رائے اور شخصی رجحان کے مخالف ہی کیوں نہ ہو۔

انسان سے غلطی اور معصیت کا صدور ایک فطری امر ہے جس طرح کسی انسان سے انفرادی طور پر غلطی ہوسکتی ہے اسی طرح اجتماعی طور پر کسی جماعت یا تحریک کا خطا و معصیت میں مبتلا ہونا بھی ممکن ہے۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی فرد یا جماعت نے آج تک یہ دعوی نہیں کیا اور نہ کرسکتی ہے کہ اس نے علم کی انتہا پالی ہے یا اسے کسی نقص اور کوتاہی کے بغیر ہر طرح کا علم حاصل ہے۔ خطا و نسیان اور لغزش و کوتاہی آخر حضرتِ انسان ہی کا تو وصف ہے؟ کوئی مسلمان اگر خطا و معصیت سے بالاتر ہوتا تو حضراتِ صحابۂ کرام ہوتے مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صحابۂ کرام سے بھی اپنے کمالِ ایمان اور تقویٰ کی اعلیٰ سطح پر ہونے کے باوجود بعض لغزشیں سرزد ہوئی ہیں، غزوۂ احد سے متعلق ہماری اسلامی تاریخی کتابوں میں جو تفصیل ہے اس کا مطالعہ کیجئے اور قرآنِ حکیم کی ان دو آیتوں کا پسِ منظر ذہن میں رکھئے تو آپ

خود اس کا اندازہ ہوگا۔

اَوَلَمّا اصابتکم مصیبة قد اصبتم مثلیها قلتم انّٰی هٰذا قل هو من عند انفسکم۔ (آل عمران : ۱۶۵)

اور جب تمہیں ایسی بار اٹھانی پڑی جس کی دوگنی تم (فریق مقابل پر) ڈال چکے تھے تو تم کہنے لگے یہ کدھر سے ہوئی، آپ کہہ دیجئے کہ وہ تمہاری ہی طرف سے ہوئی۔

حتی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون، منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاٰخرة ثم صرفکم عنهم لیبتلیکم ولقد عفی عنکم واللّٰه ذو فضلٍ علی المؤمنین۔ (آل عمران : ۱۵۲)

یہاں تک کہ جب تم (خود ہی) کمزور پڑ گئے اور باہم جھگڑنے لگے حکم (رسول) کے بارے میں اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں دکھا دیا تھا جو کچھ کہ تم چاہتے تھے، بعض تم میں وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض تم میں ایسے تھے جو آخرت چاہتے تھے پھر اللہ نے تم کو ان میں سے ہٹا لیا تاکہ تمہاری (پوری) آزمائش کرے اور اللہ نے یقیناً تم سے درگذر کی اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے۔

سلفِ صالحین کا حال یہ تھا کہ حق بات ان لوگوں سے بھی بولتے جو ان کی بات کو رد کر چکے ہیں تو برملا اور بے چون و چرا تسلیم کر لیتے، قبول حق کے سلسلہ میں ان کا انداز فکر یہ تھا کہ جب کبھی کوئی بات کہتے تو ان کی زبانِ حال یوں کہتی "اس مسئلہ میں یہ ہماری رائے ہے اگر کوئی اس سے بہتر رائے پیش کرے تو وہ ہمارے لئے قابلِ قبول ہے"۔

بعض محتاط ائمہ سلف نے بعض علماء کے ضعیف اقوال کے رد میں مبالغہ

سے کام لیا ہے اور ان کا بلیغ انداز میں رد کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کذب ابوالسنابل[1]، ابوالسنابل سے مراد عمرو بن بعلک قریشی ہیں، باوجودیکہ ان سے فتویٰ دینے میں غلطی ہوئی ہے پھر بھی حافظ ابن حجرؒ نے ان کو فقیہ قرار دیا ہے۔

مسلمان اگر کوئی غلطی کر بھی لے تو اس کے ساتھ بدسلوکی، اس کے عیوب کا اظہار، اس کے جہل اور کوتاہ فہمی کا لوگوں میں تذکرہ، خواہ اس کی موجودگی میں ہو یا غیر موجودگی میں، زندگی میں ہو یا موت کے بعد، بہرصورت حرام ہے۔ اور یہ تمام چیزیں "عیب جوئی" و "طعنہ زنی" کے جرم میں داخل ہیں کہ کوئی شخص خطار سے پاک نہیں ہوتا۔

ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے وہ جماعت جس کی زبان پر ایمان ہے لیکن دل میں ایمان نہیں، ایمانی گفتار تو ہے، ایمانی کردار نہیں، تم مسلمانوں کو اذیت اور تکلیف مت پہنچاؤ ان کے عیبوں اور غلطیوں کے تجسس میں نہ پڑو، اس لئے کہ جو شخص مسلمانوں کی ٹوہ میں پڑتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی پردہ دری فرما دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جس کے عیوب پر خدا تعالیٰ نظر رکھیں، اس کو وہ ضرور رسوا کرے گا، خواہ اس کے اپنے گھر ہی میں کیوں نہ ہو۔" (۲)

---

(۱) "کذب" کے معنیٰ اصل میں جھوٹ کے ہیں لیکن متقدمین کے یہاں یہ لفظ "خطا" یعنی غلطی کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوا کرتا تھا۔ سلف صالحین اور خود عہد صحابہ میں بعض حضرات نے اپنے بعض معاصرین کے بارے میں جہاں اس طرح کے الفاظ لکھے ہیں وہاں یہی معنی مراد ہے اور اسی معنی میں حضورؐ نے کذب ابوالسنابل فرمایا ہے۔ (مترجم)

(۲) صحیح الجامع الصغیر ۷۸۶۱ ـــــ ۷۸۶۲۔

کسی معصوم اور بے گناہ شخص پر الزام تراشنا اور تہمت لگانا کتابِ الٰہی کے اس ارشاد کی روشنی میں حرام ہے :

ومن یکسب خطیئة او اثماً ثم یرم به بریئاً فقد احتمل بهتاناً واثماً مبیناً۔ (النساء : ۱۱۲)	اور جو کوئی قصور یا گناہ کا ارتکاب کرے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو درحقیقت اس نے ایک بڑا بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا۔

یاد رکھئے ! گمان کرنے والا دوہرے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک تو بدگمانی بجائے خود گناہ ہے، دوسرے یہ بے ثبوت اور بے حقیقت تہمت و الزام تراشی بھی ہے، لہٰذا قرآن مجید کی اس وعید میں یہ گروہ بھی داخل ہیں بالخصوص ان حالات میں کہ ایسے آدمی سے مزید گناہ کا صدور ہو اور برائی کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں جیسے خدا کی نافرمانی اور سرکشی میں اضافہ، طاعات میں غفلت وکوتاہی اور تقویٰ و پرہیزگاری میں کمی، چرب زبانی، غیبت و بہتان کی کثرت، لوگوں پر حاسدانہ نگاہ اور لیڈری اور قیادت کی شدید حرص وغیرہ۔

عیب میں عیب، ہنرمند ہنر دیکھتے ہیں

اللہ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ بدگمانی اور سوءظنی ایک گھناؤنا جرم اور ناپسندیدہ عمل ہے جس کا انجام قرآن مجید کی روشنی میں تباہی اور خسران ہے۔

وظننتم ظن السوء وکنتم	اور تم نے بُرے برے گمان قائم کئے
قوماً بوراً۔ (الفتح : ۱۲)	اور تم برباد ہونیوالے لوگ ہو گئے۔

اور اس جرم کی اصل درحقیقت نفس کا دھوکہ دوسرے کی تحقیر اور عیب جوئی ہے اور شیطان کی اس اولین معصیت سے زیادہ قریب ہے جس کی اصل بنیاد تکبر اور غرور تھی "انا خیر منہ" (ص : ۷۶) اور فرعون کی اس باغیانہ روش سے بھی مشابہت رکھتی ہے جس کا اظہار اس نے یوں کیا تھا:

ام انا خیر من ھذا الذی	تو بھلا بتاؤ کہ کیا میں افضل نہیں ہوں اس
ھو مھین ولا یکاد یبین۔	شخص سے جو بے وقعت ہے اور بولنا تک
(الزخرف : ۵۲)	اسے نہیں آتا۔

خودپسندی و خودفریبی اور خیانت و دھوکہ بازی ان تین تباہ کن جرائم میں سے ہے جن کی اس حدیث میں نشاندہی کی گئی ہے:

ثلاث مھلکات، شح مطاع	تین باتیں سامانِ ہلاکت ہیں ایسا بخل جس کا
وھوی متبع واعجاب المرء بنفسہ	آدمی فرمانبردار ہو جائے، ایسی خواہش
⁂ ⁂ ⁂	جس کا آدمی پیروکار بن جائے اور انسان

کی خود رائی و خود فروشی۔ (۱)

لہٰذا مسلمان پر یہ بات لازم ہے کہ وہ اپنی ہر سطح کی بلندی، منصب و جاہ کی رفعت و شوکت اور بڑائی سے نیچے اتر کر لوگوں کے سامنے متواضعانہ چال چلے، اپنا سیاہ چشمہ اتار کر بندگانِ خدا میں خیر اور فلاح و بہبودی کی مہم میں اپنا فرض ادا کرے، حسنِ ظن کو سوءِ ظن پر اور برائت کو تہمت پر ترجیح دے اور لوگوں کے ساتھ وہ سلوک رکھے جو ایک انسان کے ساتھ ہونا چاہیئے کہ وہ بشری تقاضوں کے تحت کھاتے بھی ہیں اور بازار میں چلتے پھرتے بھی ہیں، انسان کوئی آسمانی مخلوق یا پاک دل و نیک نفس فرشتہ نہیں ہے۔ ان کی تخلیق نہ نور سے ہوئی ہے نہ نار سے بلکہ انہیں مٹی سے (من حمأ مسنون) پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ:

کل ابن آدم خطاء (۲) غلطی ہر انسان سے سرزد ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا:

ولقد عهدنا الى آدم من قبل فنسى ولم نجد له عزماً۔ (طٰہٰ: ۱۱۵) اور بہت زمانہ قبل آدم کو ایک حکم دے چکے تھے سو ان سے غفلت ہو گئی اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔

ہم کسی بھی شخص کے معاملہ میں صرف ظاہر کی روشنی میں کوئی حکم لگانے کے مجاز ہیں، باطن اور دیگر اسرار و رموز کا نگراں اور ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے لوگوں کے گریبانوں اور دلوں کو چاک کر کے تفتیش و تحقیق کے ہم اہل نہیں، بلکہ دلوں کو "دلوں کے راز داں" علام الغیوب کے حوالہ اور سپرد کر دیں اور ظاہر کی

---

(۱) صحیح الجامع الصغیر ۳۰۴۱۔

(۲) حوالہ سابق: ۴۳۹۱۔

روشنی میں ان لوگوں پر اسلام کے احکام جاری کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان میں مجبور اور مسافر سب ہیں، ان میں کوئی مؤمن بھی خیر سے خالی نہیں، اگرچہ کہ اس کا ظاہر شر و معصیت کے دلدل میں پھنسا ہوا ہو، معصیت، خباثت اور گندگی ہے۔ اس کی مثال پانی کے مٹکے کی سی ہے کہ پانی جب دو مٹکے کے بقدر ہو جائے تو اس میں خباثت کا احتمال نہیں رہتا (اسی طرح ایک انسان شر و معصیت میں مبتلا ہو لیکن خیر کے بعض پہلو اس میں ہوں تو وہ شر پر غالب آجاتے ہیں) لوگوں کو ہم اس نگاہ سے دیکھیں جو رحمدلانہ نگاہ ڈاکٹر کی مریض کی طرف ہوتی ہے، اس نگاہ سے نہ دیکھیں جو نگاہ ایک پولیس کی مجرم کی طرف ہوتی ہے۔

کچھ لوگ مرتبہ میں ہم سے بڑے ہوتے ہیں، ان کی عملی زندگی اور ان کے درجات و مراتب سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہیں نیز اولیاء اللہ میں بھی مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں کوئی غنی، کوئی فقیر، کوئی عالم اور کوئی صاحب تقویٰ، داعیانہ کردار ادا کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مختلف چیزوں کے درمیان اس اساس پر معاملہ کرے کہ وہ یا تو پاکیزہ اور مقدس ہوں گی یا ناپاک اور حقیر، جب دوسروں کے ساتھ کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو ناراضگی میں مختلف برائیوں اور خامیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔

داعی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ قریب و بعید کے تمام مسلمان بغیر کسی استثناء کے نہ صرف اس کے عقیدہ میں بلکہ فکری رجحان، رنج و الم اور امیدوں اور توقعات میں شریک ہیں۔

داعیانہ حیثیت سے آپ ہرگز یہ محسوس نہ کریں کہ آپ تمام مسلمانوں سے علٰحدہ اور الگ تھلگ ہیں، صرف آپ تنہا اسلام کے لئے خدمت انجام دے رہے ہیں اور تمام مسلمان تفریحی دلچسپیوں اور بے سود مشاغل میں مشغول اور

غفلت کی نیند سو رہے ہیں ..... یہ خیال ہرگز نہ پیدا ہو بلکہ ہر مسلمان کے ساتھ خواہ وہ دعوتِ اسلامی کے قافلہ یا کاز سے کتنا ہی دور اور پیچھے کیوں نہ ہو باہمی ربط و تعلق اور دینی انتساب رکھنا چاہیئے۔ اس لیئے کہ اللہ تعالیٰ (اتنے غیور ہیں کہ) ایک فاسق و بدکار شخص کو بھی دعوت کے کام میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے اس کام کو تقویت پہنچاتے ہیں تو ایک مسلمان تو دین کی خدمت و نصرت کا اس سے زیادہ حق رکھتا ہے، اس کے بارے میں آخر کیوں بدگمانی رکھی جائے؟

علماء نے فرمایا ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اس میں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے اُن کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور جو ایسا کریگا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملے گی۔

ھندوستان کے آخری مسلمان بادشاہ ظفرؔ نے خوب فرمایا ہے: ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر، تو جہاں میں کوئی بُرا نہ رہا

وحدت اور یکجہتی ـــــ وقت کی اہم ترین ضرورت

مسلمان اس وقت عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر ترقی کی نئی راہوں پر گامزن ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا اس موقع سے وہ عمیق غور و فکر اور وسیع بنیادوں پر تبادلۂ خیال کے بعد اپنی بکھری ہوئی ملّت کی شیرازہ بندی اور از سرِ نو صف بندی کے لائحہ عمل کو قطعیت دیتے تاکہ یہ ملّت کسی انجانی اور بے خبری کی کیفیت میں حوادث کا شکار نہ ہو جائے، اور یہ کوئی مفروضہ خیال نہیں بلکہ اس وقت مسلمانوں کی موجودہ حالت اس پر شاہدِ عدل ہے، عظیم خطرات کے احساس اور دھمکیوں کے باوجود مسلمان اپنے دینی و دنیوی مفادات سے غافل، اپنے دین کی بنیادی معلومات سے ناآشنا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، دشمن طاقتیں برابر طغیانی و سرکشی کر رہی ہیں اور مسلمان ابھی حسرت و افسوس کے اظہار ہی میں ہیں۔ طاغوتی قوتیں برابر اپنے دائرۂ کار کو وسعت دے رہی اور ہاتھ پیر پھیلا رہی ہیں، ادھر مسلمان اسی قدر پیچھے جا رہے ہیں۔ مخالف اسلام تحریک کا ترقی کی سمت سفر جاری ہے اس کے برخلاف اسلام کا دائرہ اسلامی چھاؤنیوں کے رُخ پر الحاد و اباحیت پسندی کے طوفانِ بلاخیز کے دباؤ میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ ہر پڑوسی اپنے پڑوسی کا دوست نہیں، دشمن ہے، ظلم کرتا ہے ظلم سے بچاتا نہیں اور خود اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

مسلمانوں کی بہت سی جماعتوں میں اَب بھی وہ اختلافی مسائل باقی ہیں۔ جن پر ماضی کے مسلمان سیکڑوں سال سے اختلاف رائے رکھتے آئے ہیں، اور ہر مکتبِ فکر نے اپنی شناخت کے لئے کچھ ایسی فکر و رائے اختیار کی ہے جس پر تمام لوگوں کا اتفاق ناممکن ہے اور جس پر اتحاد و وحدت کی وہ بنیاد قائم نہیں ہو سکتی جو کسی بھی حوصلہ مند قوم کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بغیر کسی مقصد کا حصول ممکن نہیں۔

اسلام کی جامع اور وسیع ترین دعوت کسی خاص رنگ و آہنگ کے ساتھ مخصوص نہیں، یا مسلمانوں کی کسی جماعت یا اصلاح کے کسی گوشہ تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک عمومی دعوت ہے جس کی اساس علم، تربیت اور مجاہدہ و جہاد پر رکھی گئی ہے اور جو معمولی سا اختلاف مسلمانوں میں پایا جاتا ہے وہ بھی صرف عبادات اور بعض اعمال کے چند فروعی و جزوی مسائل میں ہے لیکن یہ اختلاف کسی صورت میں عقیدہ کی حد تک نہیں بڑھتا اور بالفرض اگر یہ اختلاف عقیدہ کی سرحد کو چھو لے تو پھر وہ بڑے خطرہ کی بات ہے۔

عام طور پر اختلاف کی بنیاد نصوص کی عبارتوں کے مفہوم و معنی کی عدم تعیین اور دوسرے فریق کے مقاصد سے ناواقفیت ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں اخوت و بھائی چارگی پر مبنی، مفاہمت پسندانہ اور کھلے ماحول میں حقیقت و واقعیت تک پہنچ سکتے ہیں، شرعی حکم اس اختلاف کو رفع کر سکتا ہے، اور ہم "کفر و ایمان" کی بحث سے نکل کر "خطا و صواب" کے دائرۂ بحث میں داخل ہو سکتے ہیں، ایسے میں ہماری اخوت قائم رہے گی اور وحدت برقرار رہے گی،

اَب ہم سب کا مقصد صرف "حق کی معرفت" ہو، ہمارا طرزِ عمل یہ ہو کہ ہم اسلام کی خدمت و تعاون کریں اور اس کے لئے ایک جان ہو کر میدانِ

عمل میں اُتر آئیں اور کسی عصبیّت اور شر انگیز بحث و مناقشہ کے بغیر حقیقت کی تلاش و جستجو کے لئے محبت اور باہمی تعاون کے ماحول میں اختلافی مسائل کا تجزیہ کریں اور بحث و تحقیق کریں، اگر یہ صورتِ عمل کسی کے لئے ناقابلِ قبول ہو تو پھر باہمی معاہدہ طے پائے کہ ہر ایک اپنی رائے اپنے پاس محفوظ رکھے، فیصلہ انشاء اللہ خدا ہی کے پاس ہوگا۔

دینِ اسلام کے لئے کام کرنے والوں میں میل ملاپ اور محبت و یکجہتی ہو، ہر جانے پہچانے اور انجانے کو سلام کرنے کا مزاج ہو، ہمارے اسلامی قائدین پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو جنہوں نے ان پر اعتماد کیا اور ان کی قیادت پر بھروسہ کیا، دین و مذہب اور خیر و سعادت کی رہنمائی کریں، علم و معرفت اور تربیت کے صحیح اسلامی اصولوں کے ذریعہ مسلمانوں کو خیر و معروف کی تلقین میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کریں تاکہ نیکی و پرہیزگاری کے فروغ اور اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے لئے مسلمانوں کی اجتماعیت اور اُن کا تعاونِ عمل حاصل ہوسکے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

مجاہد و امام شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کے ایک خط کا میں مطالعہ کر رہا تھا جو انہوں نے ۷۰۵ھ میں دمشق میں مقیم اپنے بعض دوستوں کے نام لکھا تھا، جب کہ وہ جیل میں قید و بند کی زندگی گذار رہے تھے۔ اس خط میں انہوں نے جن خیالات اور احساسات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی عالی ظرفی فراخ قلبی، عظمت شان اور بلندی کردار کی ایک روشن مثال ہے۔ اپنے مخالفین و منکرین کے مکر و فریب، اُن کی باغیانہ سرگرمیوں اور ظالمانہ سازشوں سے قطع نظر انہیں معاف کر دیا اور ان کی شاطرانہ حرکتوں اور دغابازی سیاست، جس کے نتیجہ میں وہ جیل میں قید کئے گئے، کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز فرمایا بلکہ اپنے خط میں اپنے متبعین و متعلقین کو ہدایت دی کہ وہ کسی بھی فرد کو، کسی طرح کی اذیت و تکلیف نہ پہنچائیں۔

جیل کی کوٹھری میں نظر بند، اپنوں اور پرایوں سے دُور، خلوت و تنہائی کی کٹھن اور صبر آزما گھڑی میں بھی اللہ تعالیٰ کے غیر معمولی عطایا و احسانات اس کے فضل و کرم، طاعات پر ثابت قدمی و استقامت اور حسنِ صبر کی توفیق وغیرہ بے شمار نعمتوں کا احساس برابر انہیں خالق و پروردگار مولیٰ کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ دو چار گھڑی ذکرِ الٰہی اور خدائی انعامات پر فکر و تدبّر کی

توفیق نے اُن میں یہ شعور بیدار کیا کہ انعاماتِ الٰہی کے مقابلہ میں قید و بند کی یہ سزا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے ان تمام مخالفین کے ساتھ فراخ چشمی اور کشادہ ذہنی کا معاملہ کیا جنہوں نے الزام تراشی اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ انہیں ٹھیس پہنچائی تھی۔

اس خط کو افادۂ عام کے پیش نظر یہاں پیش کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

"آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے دین میں، جس کی بنیاد وحدت اور اجتماعیت ہے باہمی انس و محبت، کلمۂ وحدت کی بنیاد پر شیرازہ بندی اور آپسی تعلقات و معاملات کی صفائی و درستگی اہم قرآنی اصولوں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فاتقوا اللہ واصلحوا ذات بینکم۔ (الانفال: ۱)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

واعتصِمُوا بحبل اللہِ جمیعاً ولا تفرقوا (آلِ عمران: ۱۰۳)

یہ اور ان جیسی بے شمار قرآنی آیات اور فرامینِ رسولؐ ہیں جو اتحاد و یکجہتی کی ترغیب اور گروہ بندی و انتشار سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں، ظاہر ہے اسلام کے ان اصولی ضوابط کی رعایت کرنے والے ہی "وحدت پسند" ہیں اور خلاف ورزی کرنے والے "انتشار پسند" ہیں اور نفرت و عداوت کے جذبات کو انگیز کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کی تمام حدیثوں کا مقصود محض اطاعتِ رسُول اور اتباعِ شریعت ہے۔

اللہ آپ سب سے راضی ہو، دین کے اس اصول کے سلسلہ میں سب سے پہلے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا ہوں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں کسی بھی مسلمان کو اذیت پہنچانا یا اس کی ذہنی کرب و تکلیف کا ذریعہ بننا ہرگز گوارا نہیں کرتا

میں یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلہ میں میرا ظاہر و باطن یکساں ہے، کسی مسلمان کے تعلق سے میں نہ حرفِ شکایت رکھتا ہوں اور نہ کسی پر اظہارِ عتاب اور ملامت زنی کو پسند کرتا ہوں بلکہ تمام مسلمان میرے نزدیک اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے حد درجہ اکرام و تعظیم اور محبت و عزت کے مستحق ہیں اس سلسلہ میں میرا اجتہادی نظریہ تو یہ ہے، تاہم صاحبِ اجتہاد لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جن کا اجتہاد درست ہوتا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا اجتہاد خطا پر مبنی ہوتا ہے اور بعض وہ ہیں جو اپنے اجتہاد میں قصوروار ٹھہرتے ہیں ——— ان میں پہلا طبقہ اجر و ثواب کا مستحق ہے جبکہ دوسرا طبقہ اپنے اجتہاد میں اجر کا مستحق اور قابلِ عفو ہے، تیسرے طبقہ میں شمولیت سے اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

قرآن و حدیث کے مذکورہ بالا اصول کی روشنی میں ہمیں مخالفانہ پروپیگنڈہ کی تمام باتوں کو ترک کر دینا چاہیئے، جیسے فلاں شخص، فلاں معاملہ میں کوتاہ ہے، فلاں شخص بے عمل ہے، فلاں کی وجہ سے شیخ (ابن تیمیہؒ) کو تکلیف پہنچی۔ فلاں اس مسئلہ کا اصل سبب بنا ہے، فلاں شخص خیانت و فریب کی زبان میں گفتگو کر رہا ہے ——— اس طرح کی اور بھی دیگر ناپسندیدہ باتیں، جس میں اپنے ساتھیوں اور دینی بھائیوں کی مذمت ہو، ہمارے اسلامی و دینی معاشرہ میں نہیں ہونی چاہئیں، اس سلسلہ میں اب تک ہم سے جو چوک ہوئی ہے، خدا اسے درگذر فرمائے۔

آپ کے علم و اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ ہمارے بعض ساتھیوں کے بارے میں جو سخت و سست باتیں کہی گئی ہیں۔ ناشائستہ تبصرے کئے گئے اور اہانت و مذمت کا جو سلسلہ ابھی جاری ہے، اس سے وہ

آزردہ خاطر اور شکستہ دل نہ ہوں، اس طرح کی باتوں سے تو ان کی قدر و منزلت اور عزت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے اور عظمت و محبت بڑھتی ہے۔

یہ چند باتیں مسلمانوں کے مصالح و مفادات سے متعلق تھیں، جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ باہم اصلاح فرمائیں گے، ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لئے ایسا ہے جیسے جسم انسانی میں دو ہاتھ اور دو بازو، ایک بازو دوسرے بازو کے لئے ہمت و تقویت کا باعث ہے اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کا معاون ہے۔

اِصلاح کا غلط انداز

افواہ طرازی کی مہم، جس سے اس وقت دعوتِ اسلامی دوچار ہے، کی مثال ان کیڑوں کی سی ہے جو صفائی ستھرائی سے کنارہ کش ہو کر گندی جگہوں اور بدبودار کیچڑ میں نشو و نما پاتے ہیں جو جسم کے تمام اعضاء چھوڑ کر صرف پیپ اور خون آلود زخموں پر بیٹھتے ہیں، اس طرح کی سرگرمیوں میں مشغول لوگوں کا معمول اور مقصود، کسی سادہ لوح معاشرہ، جو اچھے بُرے کی تمیز اور کھرے کھوٹے میں فرق و امتیاز کی صلاحیت سے عاری ہے، کے دینی عقائد و تصورات میں تشکیکی ذہن پیدا کرنا ہے۔ ان کا مقصود تخریب کاری ہے، نوجوان نسل کی قوتِ عقل و فہم کو ماؤف کرنا، معاشرہ میں ان کے اصلاحی کردار اور دعوتی عمل کی تاثیر اور طاقت کو تباہ کرنا، زہر آلود ماحول سازی کے ذریعہ شر و فتن کی تخم ریزی، بے بنیاد پروپیگنڈہ اور راہِ خدا اور صراطِ مستقیم سے لوگوں کو دُور رکھنا ان کا نصب العین ہے۔

وقال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القراٰنِ والغوا فیہ لعلکم تغلبون۔ (حٰمٓ سجدہ: ۲۶)

اور یہ کافر (باہم) یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور (اگر پیغمبر سنانے لگیں تو) اسکے بیچ میں غُل مچا دیا کرو تاکہ تم غالب رہو۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ

اور (صدقِ دِل سے) کسی کے روبرو اقرار

دِینَکُمْ ۔ مت کرنا مگر اس شخص کے روبرو جو تمہارے
(آل عمران : ۷۳) دین کا پیرو ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے داعیوں اور ذمہ داروں نے کبھی یہ غور کیا کہ ان لوگوں کو اس مجرمانہ حرکت وعمل کا موقع کس نے فراہم کیا؟ تخریب و انہدام اور تشکیک ذہنی کی اس مہم پر انہیں کس نے جرأت وحوصلہ دیا؟ ان لوگوں نے انسانیت کی عقلِ سلیم کو فریب دیا، دلوں کی سُلگتی ہوئی انگیٹھیوں کو سرد و بے اثر بنا دیا اور فطرتِ انسانی کی تخلیقی صلاحیتوں کو ضائع کیا۔ دَراصل یہ اصلاح کے غیر فطری اور غیر تجرباتی طریقہ کا نتیجہ اور اصُولِ دعوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ جس میں علی الاعلان اور بہ آوازِ بلند اصلاح ہی کو اصل سمجھا جاتا ہے، خود نمائی اور شہرت پرستی کے پیرہن میں ملبوس نصیحت، زجر و توبیخ کے ساتھ دینی رہنمائی، تکبر آمیز لہجہ میں اصلاح کی بات اور بلا تحقیق نقد و تنقید، یہ سب باتیں دعوتی عمل میں نقصان دہ ہیں۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ نے مخاطب کی عزتِ نفس کا احترام اور نفسیاتی پہلو کا لحاظ کئے بغیر نصیحت وارشاد کا کام کرنے والوں کو جس بلیغ انداز میں توجہ دلائی ہے، اس میں ہم سبھوں کے لئے درس ہے اور خصوصاً دَاعیوں کے لئے ان کی یہ نصیحت "سُرمۂ چشم" کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے شعر کی زبان میں جو کچھ فرمایا، اس کا حاصِل یہ ہے:

"اگر آپ مجھے نصیحت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو تنہائی میں کیجئے۔ لوگوں کے سامنے مجھے نصیحت کرنے سے اجتناب کیجئے، اس لئے کہ چند لوگوں کے دَرمیان نصیحت کرنا بھی ایک طرح کی ڈانٹ ہے۔ جسے میں برداشت

نہیں کرسکتا ——— میری اس با ں
آپ عملاً خلاف ورزی کریں تو آپ اس صورتِ حال کا سامنا
کرنے کے لئے تیار ہو جائیں کہ آپ کی اطاعت کوئی
نہیں کرے گا ———"

حضرت عبداللہ بن عکیمؓ سے ایک حدیث اس طرح منقول ہے :
انہوں نے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کے بعد میں کسی خلیفہ کے خون پر اعانت نہیں کروں گا، ایک سائل نے پوچھا اے ابو معبد! کیا ان کے خون پر آپ نے اعانت کی؟ اس پر انہوں نے فرمایا آدمی کی برائیوں کے اظہار و اعلان کو میں اس کے خون پر اعانت سمجھتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جس آدمی نے کسی میں کوئی عیب دیکھا اور اس کی پردہ پوشی کی وہ شخص ایسا ہے گویا اس نے ایک زندہ درگور لڑکی کو زندگی بخشی"(۱)۔

(۱) ابوداؤد، ص ۴۸۹۱، عن عقبہ بن عامرؓ

بدگمانی اور الزام تراشی

سیرت کی کتابوں میں یہ بات ملتی ہے کہ واقعہ "واقعۂ افک[1]" کے موقع پر حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ان کی بیوی نے کہا:

ابوایوب! عائشہؓ کے سلسلہ میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کیا آپ اسے سن رہے ہیں؟

حضرت ابوایوبؓ نے بڑے پُراعتماد لہجہ میں فرمایا:

"ہاں سن تو رہا ہوں لیکن وہ سب جھوٹے ہیں"۔

---

(۱) حدیث و سیرت کی کتابوں سے واقعہ کی نوعیت صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی المصطلق (۶ھ) سے مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ ایک الگ اونٹ پر ہم سفر تھیں، راستہ میں فوج نے شب میں کہیں پڑاؤ ڈالا، فوج کے کوچ سے پہلے ام المؤمنینؓ ضرورت سے باہر نکلیں، اتنے میں فوج کے کوچ کا حکم ہو گیا، قافلہ روانہ ہو گیا اور ساتھ ہی ام المومنین کا سارا بان بھی یہ سمجھ کر روانہ ہو گیا کہ آپ اپنے ہودج میں سوار ہیں۔ ام المؤمنینؓ جب جگہ پر واپس آئیں اور دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو گیا تو شب میں اس کے سوا انہیں کوئی اور تدبیر نظر نہیں آئی کہ وہیں ٹھہر جائیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کوئی راہ پیدا کر دے، حضرت صفوان صحابیؓ اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ کے پیچھے پیچھے چلیں تاکہ بھولی بسری چیزوں کا جائزہ لے سکیں۔ جب صبح کو وہ پڑاؤ کی جگہ پر پہونچے اور دیکھا کہ ام المؤمنینؓ پیچھے رہ گئیں تو انہوں نے اِنّا للہ پڑھا، بالآخر اپنا اونٹ بٹھایا۔ ام المؤمنین اس پر سوار ہو گئیں اور انہوں نے مہار پکڑ کر اونٹ کو قافلے سے جا ملایا، فوج کے کوچ و مقام کے دوران میں اس قسم کے واقعہ کا پیش آجانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن منافقین نے اسی ذرا سی بات کو ایک افسانہ بنا ڈالا۔ مترجم

اے ام ایوب! (اپنی بیوی سے خطاب)
کیا تم سے اس طرح کا کوئی عمل ممکن ہے؟
ام ایوب نے کہا: "بخدا، ہرگز نہیں"۔
اس پر حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا:
"جب یہ بات ہے تو سن لو، بخدا عائشہؓ تم سے زیادہ بہتر، عفیف، حیادار اور غیرت مند خاتون ہے"۔

قرآن مجید کی درج ذیل آیات اسی موقعہ سے نازل ہوئیں: ان الذین جاؤا بالافك عصبة منكم لا تحسبوه شرا لكم بل هو خير لكم الخ (۱)

---

(۱) متعلقہ آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو: "جن لوگوں نے فتنۂ افک برپا کیا وہ تمہارے ہی اندر کا ایک گروہ ہے، تم اس چیز کو اپنے لئے بُری نہ خیال کرو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے حساب میں پڑا اور جو اس فتنہ کا اصل بانی ہوا ہے اس کے لئے تو عذاب عظیم ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کرتے اور کہدیتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے۔ آخر یہ لوگ اپنے اس الزام کو ثابت کرنے کیلئے چار گواہ کیوں نہ لائے؟ تو جب یہ لوگ گواہ نہیں لائے تو لازماً اللہ کے نزدیک یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، دنیا و آخرت میں تو جس چیز میں تم ملوث ہو گئے تھے اس کے باعث تم کو ایک عذاب عظیم آپکڑتا، خیال کرو جب تم اپنی زبانوں سے وہ بات نقل کر رہے تھے اور اپنے منھوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کی بابت تمہیں کوئی علم نہیں تھا اور تم اس کو معمولی بات خیال کر رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بات ہے، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کو سنتے ہی تم نے کہدیا ہوتا کہ ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایسی بات زبان پر (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

حضرات صحابۂ کرام کی نیک نفسی دیکھئے کہ وہ واقعات کی رو میں بہہ نہیں جاتے، افواہوں اور بے بنیاد باتوں کے پیچھے بے سوچے سمجھے چل نہیں دیتے جب کہ صورتحال یہ تھی کہ دشمن انہیں اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھے، افواہ طرازی، جھوٹ اور بہتان کا ایک ماحول تیار کر ڈالا تھا، مسلمان اس وقت کچھ ایسے سنگین حالات سے گذر رہے تھے کہ پل بھر کیلئے آنکھ بند کرنا مشکل ہوگیا، وہ چھوٹی چھوٹی باتیں پھیلا کر مسلمانوں کی وحدت کی کمر توڑنا چاہتے تھے، نیز وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں، قرآنِ حکیم نے نہایت بلیغ انداز میں اس صورتحال کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

واذا جاءھم امر من	اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے
الامن او الخوف اذاعوا بہ	خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے
ولو ردوہ الی الرسول والی	ہیں اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان
اولی الامر منھم لعلمہ	میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالے پر

(بقیہ ترجمہ صفحہ گذشتہ) لائیں! معاذ اللہ یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مؤمن ہو تو ایسی بات تم سے پھر کبھی صادر نہ ہو اور اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کئے دے رہا ہے اور اللہ حکیم و علیم ہے۔

بے شک جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی کا چرچا ہو، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں ایک دردناک عذاب ہے اور اللہ [illegible] ہے اور تم نہیں جانتے ہو، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور اللہ رؤف و رحیم نہ ہوتا تو تم ایک آفت میں پھنس جاتے۔

الذین یستنبطونه منهم ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطان الا قلیلاً۔ (النساء: ۸۳)

رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے۔

⁂ ⁂ ⁂

کسی مسلمان اور صاحب ایمان کیلئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ کسی بھی معاملہ میں کوئی بات بھی بغیر کسی تحقیق اور بلا سوچے سمجھے قبول کرے بلکہ اس طرح کے معاملات میں توقف کی راہ اختیار کرتے ہوئے "نتیجۂ تحقیق" تک پہنچنا چاہیئے۔ قبل از وقت تحقیق کرنا، پھر بات کو قبول کرنا، آدمی کو بعد کی ندامت اور پشیمانی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ قرآنِ حکیم کی اس ہدایت پر نظر جمائے رکھیئے:

فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔ (الحجرات: ۶)

تو تم تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ کہیں تم نادانی سے کسی قوم کو ضرر پہونچا دو (اور) پھر اپنے کئے پر پچھتاؤ۔

بات سے بات بنتی ہے اور پھیلتی جاتی ہے، لوگ تحقیق کی میزان میں تولے بغیر اس بات کو قبول کر لیتے ہیں، نہ کوئی غور و فکر ہے اور نہ کوئی رد و قبول کا معیار ——— نتیجتاً مختلف طرح کی سماجی و اخلاقی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے عیوب و نقائص کو سر بازار لانے کا ایک ناپسندیدہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور طرح طرح کے شکوک و شبہات جنم پاتے ہیں ——— (مذکورہ واقعۂ افک ہی کے سلسلہ میں قرآن نے ایک اصول یہ بیان کیا کہ مسلمان کو یہ چاہیئے کہ اپنے مسلمان بھائی بہنوں

کے ساتھ حسنِ ظن رکھے اور جب یہ سنے کہ لوگ ایک نیک شخص پر یوں ہی رجماً بالغیب بُری تہمتیں لگاتے ہیں تو اپنے دل میں ایسے خیالات کو راہ نہ دے بلکہ ان کو جھٹلائے، بے تحقیق تہمتیں تراشنا، ایمان سے بعید ہے، چاہیے کہ آدمی خود اپنی آبرو پر دوسروں کی آبرو کو قیاس کرے)

لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیراً و قالوا ھذا افك مبین۔ (نور: ۱۲)	جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور عورتوں نے اپنے آپس والوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا اور یوں کیوں نہ کہا کہ یہ صریح بہتان ہے۔

اس طرح کے عمل سے مؤمن کو ڈرایا گیا ہے، ورنہ فضلِ الٰہی اور رضاءِ الٰہی کا معاملہ کچھ اس طرح ہے:

ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ فی الدنیا والاٰخرۃ لمسکم فی ما افضتم فیہ عذاب عظیم (نور: ۱۴)	اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو جس شغل میں تم پڑے تھے اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا۔

قرآن حکیم کی یہ وہ آیتیں ہیں جو انسان کے ضمیر و وجدان کو پاکیزہ اور فکر و خیال کو تابندہ بناتی ہیں، آدمی کو اس بات سے آگاہ کرتی ہیں کہ وہ کسی مسلمان کی عزت و آبرو سے نہ کھیلے، اس لئے کہ تمام مسلمان انفرادی و اجتماعی، ہر حیثیت سے دعوتِ دین کے حامل ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ دین کی دعوت کا کام کرنے والوں کے دل پاک و صاف ہوں، دلوں میں باہمی انس و محبت ہو، آپس میں شیر و شکر بن کر رہیں، ذہنی الجھن، بدگمانی اور شکوک و شبہات کی گندگی سے دل کی زمین مکدر نہ ہو، خلوص و محبت کا خوشگوار ماحول متاثر نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وتقولون بافواهکم مالیس
لکم بہ علم وتحسبونہ ھیناً
وھو عند اللہ عظیم۔
(النور: ۱۵)

اور تم اپنے منہ سے وہ بات کہہ رہے تھے
جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تھا اور تم اس کو
معمولی بات خیال کر رہے تھے حالاں کہ اللہ
کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔

نجات پانے والی جماعت

کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی فکر سے اتفاق رکھنے والے بڑی تعداد میں ہوں، وہ سمجھتا ہے کہ وہ نیک عمل کر رہا ہے، جہالت اور ضلالت سے انسانیت کی حفاظت کر رہا ہے، پھر وہ غلو اور شدت اختیار کرتے ہوئے اپنی تحریک اور اپنی جماعت ہی کو حق اور اس کی مخالفت کرنے والے کو باطل پر سمجھتا ہے۔ قیامت تک کوئی اختلاف رکھنے والا اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسے یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ تنہا اسکی اپنی جماعت ہی دراصل جہنم سے نجات پانے والی جماعت ہے۔

حدیث کی کتابوں میں "الجماعۃ" (جماعت) کا لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں تحقیق کی ہے کہ "الجماعۃ" سے منشائے نبوی کیا ہے اور علماء اس لفظ سے کیا مراد لیتے ہیں؟ اپنی بے نظیر اور شہرۂ آفاق کتاب "الاعتصام" میں تحقیق کے ساتھ لکھا ہے کہ درج ذیل پانچ اقوال میں سے کوئی ایک قول ضرور ارشادِ نبویؐ "الجماعۃ" کی مراد ہے:

۱۔ امتِ مسلمہ کا سوادِ اعظم۔

۲۔ ائمۂ مجتہدین کی جماعت۔

۳۔ بالخصوص جماعتِ صحابہ، جنہوں نے دین کی بنیادوں کو استوار کیا جن کا کسی مسئلہ میں اجماع شرعی حجت ہے اور ضلالت پر جن کا اتفاق

محال و ناممکن ہے۔

۴۔ دنیا کی تمام قوموں اور مذاہب کے مقابلہ میں امتِ مسلمہ۔

۵۔ مسلمانوں کی وہ جماعت جو کتاب و سنت کے مطابق کسی کی امامتِ شرعیہ یا خلافت پر اتفاقِ رائے رکھتی ہو، بشرطیکہ اس ملک میں خلافت و امارت کی تمام شرائط موجود ہوں۔

مسلمانوں میں آج جتنی جماعتیں ہیں، ان میں کسی بھی ایک متعین جماعت پر ان اقوال کا انطباق کسی طور ممکن نہیں، لوگوں کی ایک گنی چنی تعداد میں یہ باتیں نہیں پائی جاسکتیں۔ بلکہ یہ اقوال تو مختلف اوصاف کا مجموعہ ہے۔ اَب جو ان اوصاف کا حامل ہوگا وہ مسلمانوں کی جماعت میں سمجھا جائے گا اور جو ان اوصاف سے خالی ہوگا وہ اس جماعت سے خارج سمجھا جائے گا۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ "طائفہ" سے مراد ممکن ہے مختلف قسم کے مسلمانوں کی متعدد جماعتیں ہوں، جن میں بہادر، امورِ جنگ سے واقف کار، فقیہ، محدث، مفسر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذمہ دار، زاہد اور عابد سب ہوں۔ اور کوئی ضروری نہیں کہ سب ایک ہی شہر میں جمع ہوں، بلکہ ان سب کا ایک ملک میں یا مختلف ملکوں میں اجتماع بھی ممکن ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب ایک شہر میں تو جمع ہوں، لیکن درجات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کم زیادہ ہوں۔

تجدید و احیاءِ دین کا مسئلہ اس سلسلہ کی نظیر ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال پر تجدیدِ دین کا کام کرنیوالوں کو بھیجتے ہیں ——— یہ ضروری نہیں کہ تمام قسم کی نیکیاں ایک ہی

شخص میں جمع ہوں۔ اس لئے کہ جن امور میں تجدید مطلوب ہوتی ہے وہ سب کسی ایک ہی قسم کے خیر میں داخل ہوں، یہ ضروری نہیں اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ہر سو سال پر اللہ تعالیٰ ایک شخص ہی کو بھیجے بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ متعدد اشخاص ہوں اور ان میں سے ہر ایک دین کے کسی خاص گوشہ میں تجدید کا کام انجام دے ——— واللہ اعلم۔

مومن کا احترام

اپنے مخالفین کے سلسلہ میں زبان درازی اور فحش و بدگوئی کی سنتِ سیئہ کی بنیاد خوارج نے رکھی، فرقۂ خوارج کے بڑے علماء اپنے پیروؤں کو لوگوں کی تکفیر (کافر قرار دینا) و تفسیق (فاسق قرار دینا) پر اکساتے تھے تاکہ ان کے دلوں میں عام لوگوں سے نفرت بیٹھ جائے اور خوارج کا آپس میں ربط و تعلق مستحکم ہو۔ یہاں سے یہ مرض دوسروں میں بھی منتقل ہونے لگا اور ہر گروہ اور جماعت کے کچھ غالی اور شدت پسند لوگ اسی مقصد سے دوسر جماعتوں اور تحریکوں کے وابستگان کو کافر، فاسق یا مبتدع اور گمراہ قرار دینے کی مہم چلاتے ہیں۔ افسوس تو اس پر ہے کہ آج کل ہم بھی سلفِ صالحین کے طریقۂ کار سے انحراف کرتے ہوئے اسی راہ پر گامزن ہیں۔

سلف میں امام بخاری ہی کی مثال لیجیے، انہوں نے ہر عالم دین سے جو صادق و دیانت دار ہو، حدیثیں حاصل کیں، خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو، جیسے عمران بن حطان اور داؤد بن الحصین خوارج سے اور ہشام دستوائی معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے، ان سے حدیث لی ہے اور ان کے علاوہ بھی مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور جماعتوں سے حدیث قبول کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمۃ نے قبول حدیث کے سلسلہ میں ایک اصول یہ نقل کیا ہے کہ بدعت کی بنیاد پر تکفیر کرنے والے ہر شخص کی حدیث

رد نہیں کی جائے گی۔ اس لئے کہ ہر گروہ اپنے مخالفین کو اہلِ بدعت اور جادۂ حق سے منحرف سمجھتا ہے اور بسا اوقات مبالغہ اور شدت کے ساتھ اپنے مخالفین کو کافر قرار دیتا ہے۔ اس لئے اگر یہی طریقہ تکفیر کے سلسلہ میں بالعموم رواج پا جائے تو پھر کوئی جماعت بھی صاحب ایمان باقی نہیں رہ سکتی، باہمی تکفیر کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا ——— قابلِ اعتماد بات یہی ہے کہ اس شخص کی روایت رد کی جائے گی، جو شریعت کے کسی متواتر اصول اور دین کی کسی بدیہی حقیقت کا انکار کر بیٹھے یا خلافِ شرع کسی بنیاد کا اعتقاد و یقین رکھے۔ ان کے علاوہ وہ تمام راویانِ حدیث جو ضبطِ حدیث کے ساتھ ورع و تقویٰ کے بھی حامل ہوں، ان کی روایت قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں (۱)۔

مسلمانوں کی عزت و آبرو کا احترام اور پاس و لحاظ ضروری ہے گویا وہ جہنم کا دہانہ ہے، اس دہانہ پر ہلاکت و تباہی سے اپنی زبان کی حفاظت کیجئے، عام لوگوں کا احترام اور اہلِ علم اور علماء کی خاص طور پر قدر کیجئے۔ تعصب اور فرقہ واریت کا چشمہ نکال پھینکئے، آپ میں صالحیت فکر اور اصابت رائے کی بنیاد پر تبادلۂ خیال کیجئے کہ حکومت مؤمن کی متاعِ گم گشتہ ہے جہاں مل جائے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، دین کے معاملہ میں ہر مخلص جو حق کا متلاشی ہو اور حق سے سرمو انحراف برداشت نہ کرتا ہو۔ اگر اسکی بات صحت و صداقت پر مبنی ہے تو اس صحیح اور سچی بات کی مخالفت کرنا دراصل بدنیتی اور فساد ہے۔

اشاعرہ کے تعلق سے علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "درء تعارض

---

(۱) شرح نخبۃ الفکر: ۱۰۱۔

العقل والنقل" میں لکھا ہے کہ اسلام کے لئے ان لوگوں کی کوششیں نہایت قابلِ قدر ہیں جو لوگ ان کے احوال اور تاریخ سے واقف ہیں اور ان کے معاملہ میں منصفانہ رائے رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اہلِ الحاد و اہلِ بدعت کے رد و ابطال اور اہلِ سنت اور حامیانِ دینِ متین کی حمایت و تائید میں ان اشاعرہ کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی ان کوششوں اور خوبیوں کی بدولت کچھ لوگ انہیں عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سلف صالحین کے طرزِ فکر سے مختلف ان کی بعض آراء کی وجہ سے کچھ لوگ ان کی مذمت کرتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کی درمیانی راہ سب سے بہتر ہے۔

یہ صورتحال صرف اشاعرہ ہی کی نہیں ہے بلکہ ہماری بہت سی علمی و دینی جماعتوں میں پیدا ہونے لگی ہے، مسلمانوں کی نظر صرف اس پر ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کی نیکیاں قبول کرتے ہیں۔ اور برائیوں سے درگذر فرماتے ہیں۔

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین	اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے
سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا	بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور
غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رؤوف	ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دے
رحیم۔ (الحشر: ۱۰)	اے ہمارے پروردگار تو تو بڑا شفیق ہے بڑا مہربان ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو شخص حق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہدایت کی بابت تلاش و جستجو سے کام لے اور بعض مسائل کی تحقیق میں اس سے غلطی ہو جائے تب بھی قرآنِ مجید کی سکھائی ہوئی اس دعاء کی روشنی میں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی غلطی معاف فرمائیں گے۔

ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا اے ہمارے پروردگار ہم پر گرفت نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔
(بقرہ: ۲۸۶)

اصلاح و دعوت میں تدریج کا انداز

یہ بات دین کی روح اور اس کے عمومی مزاج و مذاق کے خلاف ہے کہ ہم مسلمانوں کو دو باتوں میں سے کسی ایک کو فوری طور پر قبول کر لینے کا اختیار دیدیں کہ یا تو وہ اسلام اور اسلامی احکام کو پورے طور پر قبول کریں یا مکمل طور پر اسے رد کر دیں۔ بالفاظِ دیگر ہم اپنی دعوت کا فوری طور پر عاجلانہ اور مکمل اثر مسلمانوں کی زندگی پر نمایاں دیکھنا چاہیں اور قبولیتِ دعوت کو عملی طور پر زندگی میں محسوس کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے زمین میں دانے بکھیر کر فوری طور پر پھل اور پھول اور شجرۂ سایہ دار کا انتظار کرنا۔ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ تصور ہے جس سے اصلاح اور خیر کی راہیں تنگ ہوتی جاتی ہیں، ہر چند کہ داعی کا یہ "تصور" اس خواہش پر مبنی ہوتا ہے کہ اس کا عمل کامل ہو اور فوری اور نقد نتیجہ ظاہر ہو، لیکن یہ بات دعوت و اصلاح کے باب میں "صریح غلطی" ہے کارِ دعوت میں اس طرح کا ذہن رکھنے والے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ یکبارگی اسلام میں کود پڑیں اور آنِ واحد میں اسلام کا عملی لبادہ اوڑھ لیں ــــ ظاہر ہے یہ بات کسی طور ممکن نہیں، یہ لوگ دینی احکام میں اور خود نزولِ قرآن میں "تدریج" کا جو پہلو اختیار کیا گیا ہے، اُسے یکسر فراموش کر دیتے ہیں، قرآنِ مجید کی اس آیت پر ذرا غور تو کیجیے:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا۔ (الاسراء: ۱۰۶)

اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ اور ہم نے اسے (موقع موقع سے) بتدریج اُتارا ہے۔

لوگوں کی فکری و عملی تربیت و تعلیم کے نقطۂ نظر سے نزولِ احکام میں تدریج کا جو طریقہ اپنایا گیا ہے، اس کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں یہ فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی جو پہلی مفصل سورت نازل ہوئی اس میں صرف جنت و جہنم اور ثواب و عقاب کا ذکر ہے، جس کا تعلق محض ترغیب سے ہے ـــــ جب لوگ اسلام سے مانوس ہو گئے، ایمان و یقین ان کے ذہن و دماغ میں اس طرح جم گیا کہ اسلام پر عمل کے لئے بصد شوق وہ آمادہ ہو گئے اس وقت حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تعلیمات نازل ہوئیں۔ اگر پہلے ہی مرحلہ میں یہ حکم نازل ہوتا کہ: لوگو! شراب مت پیو، تو لوگ کہتے کہ "ہم کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے"۔ اگر ابتداءً یہ حکم نازل ہوتا کہ "لوگو! بدکاری مت کرو" تو نفسیاتی طور پر لوگ بضد ہوتے اور کہتے کہ "ہم کبھی بدکاری نہیں چھوڑیں گے"۔ (۱)

ہر طرح کے چھوٹے بڑے مسائل و معاملات میں دعوت و اصلاح کے لئے "نبوی اسلوب" سے زیادہ حکیمانہ، مؤثر اور کارگر کوئی طریقہ نہیں ہے۔

بخاری شریف میں ہے کہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اصلاح و دعوت کے سلسلہ میں یمن روانہ فرمایا تو انہیں آپؐ نے چند باتوں کی تلقین کی، فرمایا کہ:

"تم ان لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو اہلِ کتاب ہیں، جب وہاں تم

---

(۱) بخاری (فتح الباری ۱۰/۴۱۵)۔

پہنچو تو انہیں پہلے اس بات کی دعوت دو کہ وہ کلمۂ اسلام (أشهدُ أن لا إله إلا الله وأشهدُ أنّ محمداً رسول الله) کا اقرار کرلیں اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو دوسرے مرحلہ میں یہ بتاؤ کہ اللہ نے دن ورات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ تمہاری یہ بات تسلیم کرلیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔" (۱)

حدیث مذکور میں حکمت اور تدریج کو جو اہمیت دی گئی ہے، اُسے بآسانی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی حضور

---

(۱) بخاری (فتح الباری ۱۲۶/۹)

ے "تدریج" کا یہ انداز، دین کے مختلف احکام میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے، حدیث کی کتابوں میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں ——— چونکہ حدیثِ مذکور میں شراب کا تذکرہ آگیا ہے اس لئے اس مناسبت سے مسند احمد کی حرمت شراب کے سلسلہ میں ایک روایت کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے، جس سے دین وشریعت کے اس مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ——— حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شراب کی ممانعت (تدریجاً) تین دفعہ میں کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اس زمانہ میں اہلِ مدینہ شراب پیا کرتے تھے اور جوئے سے حاصل کیا ہوا مال کھایا کرتے تھے، تو ان دونوں چیزوں کے بارے میں لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا (کہ یہ جائز ہیں یا ناجائز؟ دریافت کرنے کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ خود ان میں سے صالح طبیعت رکھنے والوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اسلام کی عام تعلیمات اور اس کے پاکیزہ مزاج سے یہ دونوں چیزیں میل نہیں کھاتیں واللہ اعلم) ان کے اس سوال کے جواب ہی میں سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کیا، اے اللہ کے رسولؐ! مجھے بتائیے کہ خدا نے مجھ پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، پانچ نمازیں، ان پر تم مزید نوافل کا اضافہ چاہو تو کر سکتے ہو۔ پھر اس نے کہا، خدا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا ط (اے پیغمبر یہ لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ انہیں بتا دیجئے کہ ان دونوں چیزوں میں گناہ ہے، بہت فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے) تو کچھ لوگوں نے کہا کہ (اس آیت میں) شراب اور جوئے کو قطعیت کے ساتھ حرام قرار نہیں دیا گیا ہے تو وہ لوگ (گنجائش سمجھتے ہوئے) اس کے بعد بھی پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ مہاجرین میں سے ایک صاحب اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے (اور امامت کر رہے تھے اور نشہ میں تھے) انہوں نے قرأت میں کچھ گڑبڑ کر دی (اور کچھ کا کچھ پڑھ گئے) تو شراب کی ممانعت کے سلسلہ میں یہ دوسری آیت نازل ہوئی جو پہلی آیت کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہے: یاایھا الذین اٰمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰری حتی تعلموا ما تقولون (اے ایمان والو! تم ایسی حالت میں نماز کے پاس بھی نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو تاوقتیکہ (تمہیں ایسا ہوش نہ ہو کہ) تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟) مگر کچھ لوگ (اس کے بعد بھی گنجائش سمجھتے ہوئے) پیتے رہے (ہاں جیسا کہ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے اس کا اہتمام کرنے لگے کہ نماز کے قریب نہیں پیتے تھے) تو سورۂ مائدہ کی یہ آیتیں نازل ہوئیں جو پہلی دونوں آیتوں کے مقابلہ میں زیادہ سخت اور صاف صریح تھیں: یاایھا الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون ۵ انما یرید الشیطٰن ان یوقع بینکم

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

نے مجھ پر کتنی زکاۃ فرض کی ہے؟ آنحضورؐ نے اسے اسلام کے تمام شرعی احکام سے واقف کرایا۔ اس نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ ط فھل انتم منتھون ٥ (اے ایمان والو! بلاشبہ یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے (جوا ایک خاص قسم کے جوئے میں استعمال ہوتے تھے، یہ سب چیزیں) گندی اور ناپاک ہیں اور شیطانی اعمال میں سے ہیں، لہذا ان سے کلی پرہیز کرو، پھر تم امید کر سکتے ہو کہ فلاح یاب ہو جاؤ، شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور جوئے میں پھانس کر تمہارے درمیان بغض و عداوت پیدا کر دے (اور تم کو آپس میں لڑا دے) اور اللہ کی یاد سے اور نماز جیسی نعمت سے (جو بارگاہِ خداوندی کی حاضری ہے) تم کو روک دے، تو کیا اب تم (شراب اور جوئے وغیرہ سے) باز آؤ گے)

جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو ان لوگوں نے کہا "انتھینا ربّنا" (اے ہمارے پروردگار! ہم باز آئے اور اب ہم نے اس کو بالکل چھوڑ دیا) ——— پھر ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے ان لوگوں کا کیا انجام ہوگا جو راہِ خدا میں شہید ہو چکے ہیں یا اپنے بستروں پر (بیمار پڑ کر) انتقال کر چکے ہیں اور وہ شراب پیا کرتے اور جوئے سے حاصل کیا ہوا مال کھایا کرتے تھے۔ اور اب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ناپاک اور شیطانی عمل قرار دیا ہے (تو ہمارے جو بھائی ان دونوں میں ملوث تھے اور اسی حال میں انتقال کر گئے یا راہِ خدا میں شہید ہو گئے تو آخرت میں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟) تو اس کے جواب میں بعد والی یہ آیت نازل ہوئی: "لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا واٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت" الآیۃ۔ (ان صاحبِ ایمان اور نیکو کار بندوں

اپنا فضل وکرم کیا، جو کچھ آپؐ نے بتایا اس میں کمی کروں گا نہ زیادتی ——— اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ وہ شخص کامیاب ہوگیا اگر اس نے سچ کہا (۱)

آپ نے دیکھا کہ حضورؐ نے اس شخص کو کامیاب کہا ہے حالانکہ فرائض دین کے علاوہ کچھ اور بھی حقوق وواجبات اور اسلامی احکام ہیں جن کی تکمیل ضروری ہے لیکن آپؐ نے اس شخص کے لئے اس موقع پر اتنی ہی باتیں کافی سمجھیں۔

دعوت کی راہ میں ہر طرح کی نرم وسخت نفسیات رکھنے والوں کو دین وشریعت کے احکام پر متوجہ کرنے کا یہ بہت آسان نسخہ ہے۔ یعنی حکمت اور تدریج، ——— دین کی دعوت کا کام کرنے والوں کو اس بات کا بہت زیادہ اہتمام اور خیال رکھنا چاہیئے۔

پر کوئی گناہ (اور مؤاخذہ) نہیں ہے، ان کے کھانے پینے پر، جب کہ ان کا حال یہ ہو کہ وہ خدا سے ڈر کر پرہیزگاری کی زندگی گذارتے ہوں اور دل سے مانتے ہوں اور اعمالِ صالحہ کرتے ہوں الخ) (مسند احمد)

(مترجم)

(۱) متفق علیہ۔

وسعتِ نظری

ایک کامیاب داعی کا شعار

داعی کا وقار، شرافت اور نیک نفسی اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ وہ اپنے علماء، سلف اور مصلحین قوم کے بارے میں اپنی زبان محفوظ رکھے اپنے ائمہ اور اسلام کے نامور علماء و مجاہدین کے حق میں زبان کھولنا اور ان کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہنا، خود داعی کے "داعیانہ کردار" کو داغدار بناتا ہے۔

شیخ ابو عاصم سے کسی نے کہا کہ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں فلاں آدمی ایسی ویسی باتیں کر رہا تھا، اس پر انہوں نے کہا "زمین پر چلنے والے زندہ انسانوں میں کوئی بھی ایسا ہے جو لوگوں کی لاف زنی، زبان درازی اور ان کے طعن و ملامت سے محفوظ رہا ہو"؟ یعنی ہر بڑی شخصیت کے بارے میں لوگ کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں، اس طرح وہ غیر محسوس طریقہ پر اپنی شخصیت کو مجروح کرتے ہیں۔

غزنی کے قدیم شاعر اور نامور ادیب ابو الاسود الدؤلی نے ایک موقع پر کہا تھا: "جب لوگ کسی شریف و جواں مرد (نوجوان) کی سعی و کاوش کی بلندیوں کو پا نہیں سکتے تو اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور پوری قوم اس کی دشمن اور فریق بن جاتی ہے"۔

بات صرف امام ابوحنیفہؒ یا کسی اور امام کی نہیں ہے بلکہ ایسے کتنے ہی علماء، داعیانِ دین اور فاضل مجاہدین ہیں جو دسیوں اور سینکڑوں سال پہلے اپنی عملی پاکیزگی اور مجاہدانہ کردار کی بدولت، آخرت کی ابدی جنت کے مستحق ہو گئے لیکن حیرت و افسوس ہے کہ آج بھی ہماری زبانیں ان کے غیبت آمیز تذکروں سے تھکتی نہیں ہیں ——— اور عام طور پر لوگ فکر و عقیدہ کے حوالہ سے اختلاف کی بنیاد قائم کر لیتے ہیں، مثلاً فلاں "مفوض" ہے، فلاں "وحدۃ الوجود" کا عقیدہ رکھتا ہے، فلاں کج فہم و کج فکر صوفی ہے (فلاں دیوبندی ہے، فلاں بریلوی ہے، فلاں اہلِ حدیث ہے اور فلاں شخص فلاں جماعت سے وابستگی رکھتا ہے) اور اس طرح کے بہت سے ناموں سے جن کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں، لوگوں کو پکارتے ہیں، لفظ کی حقیقت و معنی سے بے خبر ہو کر بعض ایسے ناموں سے پکارتے ہیں کہ ان ناموں کا مطلب اگر وہ سمجھ جائیں تو شاید کبھی ان کا استعمال نہ کریں۔

امام بخاریؒ کے بارے میں بعض لوگوں نے اس طرح تبصرہ کیا ہے: "خلقِ قرآن کے ایک مسئلہ میں شیخ ابوزرعہ و شیخ ابوحاتم نے انہیں متروک قرار دیا ہے۔" (۱)

---

(۱) یہ مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے جو عقائد کی کتابوں میں موجود ہے، امام بخاریؒ نے بھی کتاب "خلق افعال العباد" میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور محدثانہ رنگ میں باطل عقائد کی تردید کی ہے، کتاب الرد علی الجہمیہ میں بھی مختلف عنوان سے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اس کی صفت ہے، اللہ تعالیٰ قدیم ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی صفت بھی قدیم ہوگی، لہٰذا قرآن قدیم غیر مخلوق ہے، اہلِ سنت والجماعت کا مسلک یہی ہے۔ معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن مخلوق ہے، حادث ہے، ایک زمانہ میں یہ فتنہ

(بقیہ آگے صفحہ پر)

مسلمانوں پر اللہ ہی رحم فرمائے! امام بخاریؒ کو متروک قرار دینے کا کوئی جواز ہے؟ جب کہ وہ حدیث و سنت جیسے باعظمت فن کے بنیا و باخبر امام ہیں اور اہلِ سنت والجماعۃ کے سرخیل و سرگروہ ہیں۔

شیخ تاج السبکیؒ فرماتے ہیں:

"ہمارے زمانہ میں بعض لوگوں کا تعصب، تنگ نظری اور سطحیت فکری کچھ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ دوسرے کو

(بقیہ صفحہ گذشتہ) بہت شدت پر تھا حتیٰ کہ حکومتِ وقت بھی معتزلہ کے دامِ تزویر میں مبتلا ہوگئی، اس وقت کے علماء نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اس فتنہ کا مقابلہ کیا، امام احمدؒ نے اس میں بہت جد وجہد کی اور بہت تکلیفیں اٹھائی، یہاں تک کہ یہ فتنہ ختم ہوگیا لیکن امام احمد بن حنبلؒ کے بعض معتقدین نے اس مسئلہ میں بہت غلو کیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن پڑھتے وقت جو آواز انسان کی ہوتی ہے وہ بھی قدیم ہے، بعضوں نے ازحد غلو کیا اور کہا کہ جس کاغذ پر قرآن لکھا گیا وہ بھی قدیم، جس روشنائی سے لکھا گیا وہ بھی قدیم ہے ——— بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ امام احمد اور امام بخاری میں اختلاف ہے حالانکہ دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں، امام احمدؒ فرماتے ہیں "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" امام بخاریؒ بھی یہی فرماتے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ قاری کی آواز حادث ہے، اس لئے کہ قاری حادث تو اس کی آواز بھی حادث ہی ہوگی۔ امام احمدؒ سے یا امام احمدؒ کے کسی امام شاگرد سے یا سلف سے اس کے خلاف منقول نہیں۔ نہ ان میں سے کسی نے کہا کہ قاری کی آواز قدیم ہے بلکہ امام احمدؒ نے متعدد جگہ صراحت کی ہے کہ قاری کی قرأت کے وقت جو آواز سنائی دیتی ہے وہ قاری ہی کی آواز ہے اور اس کی تائید "زینوا القرآن بأصواتکم" سے بھی ہوتی ہے۔ امام احمدؒ نے تو اتنا کہا "من قال لفظی بالقرآن مخلوق فھو جھمی" لوگوں نے سمجھا کہ لفظ اور صوت دونوں ایک ہیں، اس لئے کہدیا کہ امام احمدؒ صوت کو قدیم کہتے ہیں اور امام بخاریؒ حادث، لہذا اختلاف ہوگیا، حالانکہ امام احمدؒ نے صوت کو قدیم نہیں کہا، اسی لئے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب "خلق افعال العباد" میں لکھا ہے کہ لوگوں نے امام احمدؒ کی بات کو سمجھا نہیں۔ بہرکیف قرآن کا لفظ و معنی دونوں اللہ کا کلام ہے، قدیم ہے، غیر مخلوق ہے۔ البتہ ہمارے افعال، آواز وغیرہ حادث ہیں، پس کوئی اختلاف نہیں۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ خلقِ قرآن کے مسئلہ میں امام احمدؒ اور امام بخاریؒ دونوں کو شدید کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں کا معاملہ ایک ہی تھا، یہ درست نہیں۔ امام احمدؒ نے تو معتزلہ کا مقابلہ کیا اور استقامت دکھائی اور امام بخاریؒ نے متشددین حنابلہ کے مقابلہ میں تکلیف اٹھائی اور راہِ عزیمت اختیار کی۔

(مترجم)

برداشت کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی، ایک صاحب نے علامہ شیخ محی الدین نوویؒ کی "شرح صحیح مسلم" کی کتابت کرتے ہوئے ایک خیانت آمیز حرکت یہ کی کہ علامہ نوویؒ نے ایک جگہ "احادیث صفات" پر جو کلام کیا ہے، اسے کتابت میں حذف ہی کر دیا کیونکہ شیخ نوویؒ اشعری العقیدۃ تھے اور کاتب اس سلسلہ میں عقیدہ کے اعتبار سے ان کے خلاف رائے رکھتا تھا، تنگ فکری کی وجہ سے کاتب اس بات کو برداشت نہ کرسکا کہ کتاب کا وہ مضمون اپنے حال پر باقی رہے، اس لئے اس حصہ کو حذف کرڈالا ——— میرے نزدیک یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ یہ شریعت میں تحریف ہے ——— اپنے اس عمل کے ذریعہ اس نے چوری اور خیانت کا ایسا دروازہ کھول دیا جس کے بعد دینی و شرعی کتابوں کے مضامین کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔" (۱)

شیخ ابن رجب حنبلیؒ نے اپنی کتاب "القواعد" کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے:

"کسی طرح کے بھی اختلافی معاملات میں پہلے خوب غور و فکر کرنا چاہیے، تاکہ اختلاف کی بنیاد ہی ختم ہو جائے، ورنہ پھر کوئی عذر تلاش کرنا چاہیے اور کسی کو معذور سمجھنے اور اس کا عذر قبول کرنے میں فراخ دل اور کشادہ ذہن ہونا چاہیے کہ عجلت میں مصنف سے شاید سہو ہوگیا یا کوئی چوک ہوگئی ——— دنیا میں سب سے زیادہ محفوظ اور خطا و سہو کے تمام امکانات سے بالاتر کتاب تو صرف اللہ کی کتاب

---

(۱) قاعدۃ فی الجرح والتعدیل، ص: ۴۸۔

ہے اور وہ شخص انصاف پسند اور میانہ رو ہے جو کسی آدمی کی بہت سی صحیح باتوں کے مقابلہ میں اس کی چند غلطیوں کو درگذر کر دے"(۱)

کبھی کبھی آدمی کسی کے بارے میں وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے تو بھی اختلاف کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے یا وہ کسی مسئلہ میں ائمہ مجتہدین کی طرح تاویل سے کام لیتا ہے:

"اس سلسلہ میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اجتہادی مسائل میں سے کسی مسئلہ کا انکار، دلیل و استدلال کی وضاحت کے بغیر جائز نہیں، محض تقلید کی وجہ سے کسی اجتہادی مسئلہ کا انکار، جاہلوں اور نفس پرستوں کا شیوہ ہے ..... بغیر دلیل کے ایک قول کو دوسرے پر ترجیح دینا بھی صحیح نہیں ہے ——— بلکہ جو لوگ کسی امام کی تقلید کرتے ہیں، انہیں تو کسی مجتہد کے اجتہاد کو صحیح یا غلط قرار دینے کا اختیار ہی نہیں ہے اور جو لوگ اس سلسلہ میں کچھ علم رکھتے بھی ہیں تو انہیں جس بات کے بارے میں حق ہونے کا یقین ہو اُسے قبول کرنا چاہیئے اور جس کے بارے میں باطل ہونے کا یقین ہو، اسے رد کرنا چاہیئے اور اگر کسی مسئلہ میں کوئی بات واضح نہ ہو تو خاموشی اور توقف بہتر ہے۔" (۲)

---

(۱) القواعد، ص: ۲۔

(۲) الفتاویٰ الکبریٰ لابن تیمیہؒ ۱/۱۹۴۔

شوقِ شہادتؑ

سب سے زیادہ خوش بخت و سعادتمند انسان وہ ہے جسے خدا کی راہ میں جہاد و مجاہدہ کی توفیق میسر آئے، کیونکہ جہاد ایک ایسا عظیم عمل ہے جس میں طاعت و عبادت کی مکمل روح اور عبدیت و بندگی کی تمام رنگینیاں سمٹ آتی ہیں اور یہی عمل آدمی کو معرفت و محبت کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے ——— اگر فی الواقع جہاد کا مقصد اللہ کی خوشنودی کا حصول اور کلمۂ توحید کی سربلندی ہو تو وہ اس امت کیلئے محض ایک جہاد و مجاہدہ ہی نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری اور ترکِ مادّیت کی ایک ایسی راہ ہے جو آدمی کو جنت تک پہنچاتی ہے، اور ابدی راحت و نعمت کا پیام دیتی ہے ——— اس لئے اگر کوئی شخص صدق دل سے شہادت کی آرزو اور تمنا رکھے اور شوق و تمنا کی اس کیفیت میں طبعی موت مرے، تب بھی اللہ تعالیٰ اسے شہداء کے مرتبہ تک پہنچا دیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی کارِ دعوت کی بنیاد رکھے اور اس کی ایک مضبوط عمارت قائم کر دے تو اسے چاہیئے کہ اس کارِ خیر یا معروف کے اس شجرۂ طوبیٰ کو دوام و ثبات عطا کرے اور اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا ڈالے، اسے اپنی ایسی فکر بنائے جس کے بالمقابل دنیا کی کوئی طاقت، رکاوٹ اور حائل نہ ہو، اپنے دل میں عقیدہ کو راسخ کرے، گذشتہ تاریخ کے آئینہ میں

اپنا محاسبہ کرے، مستقبل کے عزائم، منصوبوں اور امیدوں کو پیشِ نظر رکھے اور اپنی زندگی کے لئے اسلامی طریقۂ حیات کا انتخاب کرلے ——— اور ان سب کے پیچھے اللہ کی وہ قدرت و مشیت کارفرما ہو جو ہمیشہ غالب ہی رہتی ہے۔

شہید کا خون تو ناقابلِ فراموش ہوتا ہی ہے، ..... لیکن ایک اور شہید ہے، جسے شہیدِ قرآن کہا جاتا ہے، یعنی جو قرآن کے سایہ میں اپنی زندگی کے روز و شب گذارتا اور لیل و نہار بسر کرتا ہے، باطل کے سامنے سرنگوں ہونا اسے ہرگز برداشت نہیں، کسی سرکش اور باغی شریعت کے کسی فیصلہ کو وہ تسلیم نہیں کرتا ——— ایسا آدمی دنیا ہی میں شہادت کا عملی ثبوت پیش کرتا ہے، راہِ خدا میں جہاد و قتال کرتے ہوئے دشمنانِ خدا کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرلیتا ہے (ایسے لوگ بھی انشاء اللہ اپنے عمل کے مطابق اخرت میں اجر و ثواب ضرور پائیں گے)

اگر کسی آدمی کے صاحبِ ایمان و صاحبِ تقویٰ ہونے کے سلسلہ میں متعدد ثبوت جمع ہوں اور زمانہ کے نیک و مؤمن لوگ اس کی دین داری اور اطاعت شعاری کی تعریف بھی کرتے ہوں تو ہمیں شرعاً یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ "فلاں شخص شہید ہے"، لیکن شہادت کی یہ صراحت بھی گمانِ غالب کی بنیاد پر ہو، قطعیت و یقین کے ساتھ نہیں، کیوں کہ قطعی علم تو صرف خدا کو ہے۔

اگر متعدد مسلمان، کسی شخص کی جہاد کے سلسلہ میں غیر معمولی دلچسپی اور خواہش کی گواہی دیں تو اس شخص کی شہادت کے سلسلہ میں بھی ان کی گواہی معتبر قرار پائے گی۔ اسی لئے سلفِ صالحین نے بدر و اُحد اور دیگر اسلامی معرکوں میں قتل ہوئے مسلمانوں کو "شہید" قرار دینے پر اتفاق کیا ہے،

اور علمائے سلف کا یہ فیصلہ بھی ظاہری حکم اور ظنِ غالب کی بنیاد پر ہے (۱)

اس سلسلہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جن مقتول مسلمانوں کے لئے آنحضورؐ نے شہید ہونے کی گواہی دی ہے ہم بھی ان کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں اور جن لوگوں کیلئے آنحضورؐ نے جنتی ہونے کی شہادت نہیں دی ہے ان کے بارے میں علماء کی ایک جماعت یہ رائے رکھتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے جنت کی شہادت دی جائے اور نہ ہی اس بات کی کہ وہ خدا کے محبوب ہیں۔ ایک دوسری جماعتِ علماء کا یہ خیال ہے کہ جن لوگوں کا صاحبِ ایمان وصاحبِ تقویٰ اور خداترس ہونا، عام لوگوں کے درمیان معروف ہو اور تمام مسلمان ان کے زہد وتقویٰ اور ورع واحتیاط کی شہادت دیتے ہوں مثلاً حضرت عمر ابنِ عبدالعزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت سفیانِ ثوریؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت ابوسلیمان دارانیؒ، حضرت معروف کرخیؒ اور حضرت عبداللہ بن مبارکؒ وغیرہ، تو ہم بھی ان کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں (۲) اور مؤخرالذکر رائے ہی ابنِ تیمیہؒ کی رائے ہے۔

تمام مسلمان شہیدوں اور علماء ومجاہدوں پر اللہ کی رحمت نازل ہو، خدا بخشے ان لوگوں کو جو اپنے علماء، سلف، شہداء اور مجاہدین کے ساتھ بدگمانی رکھتے ہیں، ہم تو ان بزرگوں کے بارے میں یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کے نیک بندے اور دین کے داعی وسپاہی ہیں۔

---

(۱) فتح الباری ۶/۹۰۔

(۲) مجموع الفتاویٰ ۱۱/۵۱۸۔

یہ تھے ہمارے اسلاف

جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی زندگی اعتدال، توازن، میانہ روی اور حسنِ توفیق کا مجموعہ بن جائے، اسے ماضی کے دریچوں میں جھانک کر اپنے اسلاف کی زندگی کا مطالعہ اور ان کی شخصیت و کردار کا بنظرِ غائر جائزہ لینا چاہیئے اور ان کی زریں نصیحتوں پر عمل کی کوشش کرنی چاہیئے ——— اس سلسلہ کی کچھ قیمتی اور عبرت آمیز باتیں امام الحرمین ابو المعالی الجوینی نے اپنی کتاب "غیاث الامم فی التیاث الظلم" میں تحریر فرمائی ہیں، اس کا ایک اقتباس آپ بھی پڑھئے:-

"سلفِ صالحین ہمیشہ نازک اور پیچیدہ مباحث میں الجھنے، دقیق مسائل کی تہہ میں جانے اور تفردات[1] کی راہ اختیار کرنے سے روکتے تھے شبہات پر توجہ دینے اور کسی کے سوال کے بغیر بہ تکلف جواب دینے سے منع فرماتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پوری توجہ نیکی اور صلاح و تقویٰ کے حصول، ایذا رسانی سے اجتناب اور حتی المقدور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری پر مرکوز رکھی جائے، متاخرین نے الفاظ و اصطلاحات کی جو قید و بند لگائی ہے اور اختلافی مسائل میں بے جا تحقیق کی سعی کی ہے وہ اس سے مجتنب اور گریزاں تھے، غور کرو کہ یہ اس کے باوجود تھا کہ وہ تمام لوگوں میں زیادہ ذہین اور ذکی بھی

---

[1]: تفردات، خود رائی یا جمہور علماء کی رائے سے ہٹ کر،

تھے اور زبان و بیان میں بھی درک و کمال حاصل تھا۔ لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ شکوک و شبہات، ضلالت اور تباہی کا پہلا زینہ ہیں، اس لئے وہ عام مسلمانوں کے حق میں اس کو نقصاندہ سمجھتے تھے جیسا کہ آج مسلمان اس میں مبتلا ہیں اور پوری طرح اس مرض میں گرفتار ہیں ان کے اپنے انجام سے صحیح طور پر آگاہ کرتے۔ سلفِ صالحین کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ باریکیوں میں جانے سے منع فرماتے، ایسی باتوں سے گریز کرتے جو ان کو اس میں الجھائے بلکہ اس طرح کا عمل کرنیوالوں پر وہ سخت ناراض بھی ہو جاتے۔" (۱)

اس اقتباس سے آپ کو سلفِ صالحین کی پاکیزہ زندگی کا یقیناً اندازہ ہوا ہوگا کہ ان کی زندگی کس قدر مثالی اور بے داغ تھی، ان کے دل پاک و صاف تھے، ان کا علم گہرا تھا، بے جا تکلف سے وہ پرہیز کرتے تھے، بعض دینی مسائل و احکام میں انہوں نے اختلاف کیا لیکن فکر و رائے کے اختلاف نے انہیں مختلف گروہوں، ٹکڑیوں اور جماعتوں میں تقسیم نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ مذہب سے بیگانہ نہیں ہوئے بلکہ وہ ایک دوسرے کے خیرخواہ، دوست اور مددگار رہتے، اسلامی اخوت و برادری ان کے درمیان باقی اور قائم تھی لیکن آج ہم؟ ..... بعض دفعہ محض الفاظ و تعبیر میں اختلاف رکھتے ہیں، پھر بھی عداوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور بسا اوقات ایسی معمولی بات پر اختلاف ہوتا ہے جس کی بنیاد افضل اور غیر افضل کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی خلافِ اولیٰ رائے پر عمل کر کے امت کی وحدت اور انکی اجتماعیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے تو ایسے

---

(۱) ص: ۱۹۔

اولیٰ و افضل عمل سے بہتر ہے جس کی وجہ سے امت میں اختلاف و انتشار پیدا ہوتا ہو، چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں "ایک ہی بات پر عمل کرنا کبھی مستحب ہوتا ہے اور کبھی اسی کا ترک بہتر ہوتا ہے، دراصل اس کو کرنے اور ترک کرنے میں جو مصلحتیں مضمر ہوتی ہیں، اس کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ایک مسلمان کا طریقہ کار بھی یہی ہونا چاہیئے کہ کبھی وہ کسی مستحب عمل کو اس خیال سے ترک کردے کہ اس کے عمل سے فائدہ کی بہ نسبت نقصان زیادہ پہنچے گا، اس مسئلہ کی نظیر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں رکھے گئے ستونوں پر محض اس لئے نہیں فرمائی کہ کہیں نئے اسلام قبول کرنے والے لوگ اسلام کے تعلق سے بدظن اور متنفر نہ ہوجائیں، اس لئے امام احمدؒ اور بعض دیگر ائمہ فقہ نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ امام، اپنے مقتدیوں کو ایک رائے پر جمع کرنے اور ان کے درمیان الفت و محبت پیدا کرنے کے مقصد سے اس عمل کو ترک کردے جو اس کے اپنے زاویۂ فکر اور شرعی دلائل کی روشنی میں افضل اور بہتر ہو، کیوں کہ ایک طرف افضل طریقہ پر عمل کرنے میں یہ مصلحت ہے کہ بہتر بات پر عمل ہوگا، دوسری طرف خلافِ افضل رائے پر عمل کرنے میں مقتدیوں کی تالیفِ قلب ہوگی اور ان کو متحد رکھا جاسکے گا، اور یہ دوسری مصلحت پہلی مصلحت سے بڑھ کر ہے۔ لہذا یہاں افضل طریقہ کو ترک کرنا درست ہوگا (۱)۔

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۲۴/۱۹۵۔

کامیاب داعی

حکمت، عطیۂ خداوندی کا بیش بہا خزینہ ہے۔

یوتی الحکمۃ من یشاء، ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔ (البقرۃ: ۲۶۹)	وہ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوگئی اسے یقیناً خیر کثیر عطا ہوگئی۔

وہ علم، تحقیق، تجربہ اور جستجو کا نتیجہ ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے: لاحلیم الاذو عثرۃ ولاحکیم الاذو تجربۃ (۱)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حکمت مؤمن کی گم گشتہ متاع گرانمایہ ہے جہاں پالے، وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ حکمت، علم کا ایک حصہ ہے جس کے طلب گار اور خواہشمند اب کم لوگ ہیں۔ اس کی قدر و قیمت رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے تاہم جو شخص علم حکمت کا حامل ہو جائے تو وہ لوگوں کے درمیان حسد بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

لاحسد الا فی اثنتین، رجل اٰتاہ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا ویعلمھا۔ (۲)	حسد صرف دو آدمیوں کے بارے میں ہوتا ہے ایک وہ شخص ہے جسے اللہ نے حکمت سے سرفراز فرمایا اور وہ اس کے ذریعہ فیصلے بھی کرتا ہے۔ اور اس کی تعلیم بھی دیتا ہے۔

(۱) صحیح بخاری (الادب المفرد) ۲/۲۷... ترمذی ۶/۱۸۲۔
(۲) صحیح بخاری (فتح ۱/۱۷۶ — ۱۷۷)

کیا ہمارے لئے مناسب نہیں کہ علمِ حکمت سیکھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

انما العلم بالتعلم والحلم	علم سیکھنے سے آتا ہے اور حلم، بردباری اور متانت
بالتحلم ومن یتحر الخیر یعطه	سے، جو شخص خیر کی راہیں تلاش کرے اسے خیر
ومن یتوق الشر یوقه۔	عطا کر دیا جاتا ہے اور جو برائی سے اپنا دامن بچائے
(۱)	اسے اس سے حفاظت کی توفیق مل جاتی ہے۔

ان حدیثوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے اسلامی داعی پاکیزہ خیالات اور نرم گفتاری کے خوگر ہوں اور قابل ستائش کارکردگی اور تعمیری جدوجہد کے ذریعہ اپنی شخصیت کو آراستہ کرنے کی امنگ اور حوصلہ و ہمت رکھتے ہوں۔

کارِ دعوت سے وابستہ ہمارے بعض دینی بھائی، اللہ تعالیٰ انہیں خیر کی توفیق ارزانی عطا فرمائے جو ماشاء اللہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فروغ اور خیر و فلاح کے کاموں میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں اور جواں عزم و حوصلہ کے مالک ہیں، وہ بسا اوقات دعوت کی راہ میں بعض ایسی زیادتیاں کر جاتے ہیں جن کے منفی اور مضر اثرات دعوتی عمل پر پڑتے ہیں۔ دعوت میں حکمت، نصیحت میں تدریج اور جو لوگ ابھی دین سے واقفیت کی ابتدائی منزل میں ہیں، ان کی تعلیم و تربیت کا نظم وغیرہ امور کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے، دین کے راستہ پر آنے والے بھولے بھالے اور سادہ لوح مسلمانوں کے ذہن میں لمبے چوڑے اور پیچیدہ مسائل، صفاتِ باری کے مباحث اور دیگر غیر ضروری اختلافی مسائل بھر دیئے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

---

(۱) صحیح الجامع الصغیر (۲۳۲۴)

کہ وہ معصوم مسلمان دین کی بنیادی تعلیمات اور طہارت و نماز اور عبادات کے مختلف اور معمولی مسائل و احکام سے نابلد رہ جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے واقف ہوتا اور اپنے آپ کو "تفقہ فی الدین" کے زیور سے آراستہ کرتا۔ اس قسم کے اختلافی مباحث میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی زبان میں کامیاب داعی وہ ہے جو پہلے لوگوں کو دین کی ابتدائی باتوں کی تعلیم دے اور تعلیم و تربیت میں تدریجی ارتقاء کا بطور خاص خیال رکھے۔ اسی حقیقت کو علامہ شاطبی نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: ——— ہر بات لوگوں کے درمیان پھیلانا اور عام کرنا ضروری نہیں۔ اگرچہ کہ وہ دینی و شرعی لحاظ سے برحق اور لوگوں کے لئے فائدہ مند ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی دینی باتیں مختلف طرح کی ہوتی ہیں۔ کچھ چیزیں وہ ہوتی ہیں جن سے عوام کی واقفیت ضروری ہے اور لوگوں کو ان چیزوں سے باخبر رکھنا مطلوب ہے۔ علوم دین و شریعت کا بڑا حصہ اسی ذیل میں آتا ہے اور کچھ چیزیں وہ ہوتی ہیں جن سے عوام کو باخبر کرنے کی مطلق ضرورت نہیں، یا پھر حالات، ماحول اور موقع و محل کی مناسبت سے یا بعض خاص افراد کے لئے بیان کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے کہ دین کی یہ باتیں اپنی جگہ برحق ہوتی ہیں۔ لیکن بسا اوقات ان سے بعض فتنے جنم پاتے ہیں، فتنہ و فساد کے سدِ باب کے مقصد سے اس طرح کی باتوں کو عوام میں پیش کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر علمِ متشابہات کے سلسلہ میں گفتگو ہے۔ یعنی قرآنِ مجید کی وہ آیات جن کا تعلق متشابہات سے ہے، ان میں گفتگو اور رائے زنی سے روکا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس سلسلہ میں جب بحث اور گفتگو ہوگی تو عین ممکن

ہے کہ گفتگو میں کوئی ایسی بات بھی آجائے جو حقیقتِ حال کے برعکس ہو۔
حضرت علیؓ سے منقول ایک حدیث میں ہے:

حدثوا الناس بما یفهمون	لوگوں سے ان کی قوتِ فہم کی رعایت کے ساتھ
اتریدون ان یکذب اللہ و	گفتگو کرو، ورنہ بصورتِ دیگر تم کیا یہ چاہتے
رسولہ۔ (۱)	ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے؟

اسی طرح کسی مبتدی طالب علم سے وہ باتیں بیان نہ کی جائیں، جو دراصل کسی منتہی طالبِ علم کے معیار کی ہوں بلکہ اس میں تدریجی ترقی کا لحاظ ہونا چاہیئے۔ مبادیاتِ دین سے پہلے واقف کرایا جائے۔ پھر مزید معلومات فراہم کی جائیں ——— ہمارے علماء نے اس سلسلہ میں چند ایسے مسائل کی نشاندہی کی ہے جن کے بارے میں فتویٰ دینا جائز نہیں ہے اگرچہ کہ وہ مسائل فقہی نقطۂ نظر سے بالکل درست ہیں۔ ان کے بارے میں فتویٰ دیا جانا صحیح ہے ——— مثلاً عام لوگوں کا مسائل فقہ کی وجوہات کی بابت سوال کرنا اور احکامِ شریعت کی حکمت دریافت کرنا ممنوع قرار دیا گیا، گو کہ ہر فقہی مسئلہ کسی نہ کسی حکمت و علت پر مبنی ہے لیکن اس کے باوجود اس طرح کی باتیں عام لوگوں کو بتانے سے احتراز کی تلقین کی گئی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے ایک خاتون نے استفسار کیا کہ حائضہ عورت روزہ کی تو قضا کرے لیکن نماز کی قضا کیوں نہ کرے؟ حضرت عائشہؓ نے سخت ناپسند کیا، کثرتِ سوال اور تعلیماتِ دین و احکامِ شرع کی باریکیوں میں جانے پر تنبیہ فرمائی۔

---

(۱) بخاری شریف (فتح الباری ۱/۲۳۵ — ۲۳۶)

حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک عیسائی کو اس لئے مار بھگایا کہ وہ علوم قران سے متعلق بعض ایسی چیزیں دریافت کرتا تھا جن کا عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نیز اس طرح کے سوالات گو اپنی جگہ بالکل بجا اور درست ہوں لیکن وہ بسا اوقات عام لوگوں کے ذہن و دماغ میں مختلف خیالات اور فتنوں کو جنم دیتے ہیں۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر بات خواہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو، عوام میں پھیلانے اور اس سے واقف کرانے کی نہیں ہوتی ہے۔

حضرت امام مالکؒ نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ ان کے یہاں بہت سی حدیثیں اور معلوماتِ دین وہ ہیں، جنہیں انہوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا اور نہ اس سلسلہ میں کسی سے گفتگو کی۔ امام مالکؒ ان مسائل میں گفتگو سے احتراز کرتے تھے جن کا براہِ راست عمل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ انہوں نے اس سلسلہ میں بعض اپنے پیش رو اہلِ علم کی مثالیں بھی پیش کی کہ وہ اس طرزِ عمل کو ناپسند کرتے تھے۔

متلاشیانِ حق کے اوصاف

مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی خلیج اور صحتمند تعلقات کے فروغ میں اہم ترین رکاوٹ باہمی غلط فہمی اور ایک دوسرے سے قریب ہوئے بغیر دُور ہی سے الزام تراشی کا سلسلہ ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں عام مسلمانوں کے مابین کھلے طور پر بات چیت اور آپسی تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم کئے جانے چاہئیں تاکہ ذہنی بعد اور کشیدگی کا ماحول ختم کرکے قربت و اپنائیت کی فضا ہموار کی جاسکے اور دونوں فریق اختلاف و رنجش کی سرزمین سے نکل کر اتفاق و وحدت کی زمین پر اپنا آشیانہ تعمیر کرسکیں۔ اس طرح کی تبادلۂ خیال کی نشستوں میں نقاطِ اتفاق اور نقاطِ اختلاف متعین ہوسکیں گے اور ہر فریق اپنا نقطۂ نظر پیش کرسکے گا۔ اختلافی مسائل پر تبادلۂ خیال کے لئے اس طرح کی پاکیزہ، صاف ستھری اور ذہنی تحفظات سے خالی علمی تحقیق کی فضا پیدا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے جو محبتِ الٰہی اور تلاشِ حق کے جذبہ کے زیرسایہ پروان چڑھتی ہو اور جس کے پیچھے ہٹ دھرمی اور تعصب کارفرما نہ ہو۔

کسی مسئلہ میں حق ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے، بیک وقت دو متضاد باتیں حق نہیں ہوسکتیں، اس لئے حق کی تلاش پوری یکسوئی، خلوص اور غیرجانبداری کے ساتھ ہونی چاہئے۔ جب کسی حق بات پر باہمی اتفاق ہوجاتا ہے تو شیطان

کے لئے اپنی دسیسہ کاری کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

حق بات اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو ایک مسلمان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ برابر غور و فکر اور تحقیق و تفتیش میں لگا رہے لیکن اپنے مخالفین سے عداوت بھی نہ رکھے، باہمی کشیدگی اور آپسی اتحاد کا ذریعہ نہ بنے بلکہ ہر فریق دوسرے کا برابر احترام برقرار رکھے۔

احیاءِ علوم الدین میں امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر گفتگو کے موقع پر اہلِ علم کو چند باتوں پر توجہ دینی چاہیئے:

پہلی بات تو یہ کہ ان مسائل پر بحث ہو جو کثرت سے پیش آتے ہوں یا جن کے پیش آنے کا قوی امکان ہو جیسا کہ عہدِ صحابہ کا معمول تھا۔

دوسری بات یہ کہ بحث و گفتگو تنہائی میں ہونی چاہیئے کہ خلوت اور پرسکون ماحول، مسائل کی یکسوئی کے لئے ضروری ہے، ذہنی پاکیزگی برقرار رہتی ہے، اس کے جہاں اور بہت سے فوائد ہیں، ان میں ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ آدمی بہت سے نفسانی شرور سے بچ جاتا ہے، کیونکہ گفتگو کے وقت لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو جائے تو فریقین میں ریا و نمائش، شہرت طلبی اور بہر طور غلبہ پانے کے جذبات اُبھر آتے ہیں، چاہے حق کے ذریعہ ہو یا باطل کے ذریعہ۔

تیسری بات یہ کہ ہر فریق طلبِ حق میں اس شخص کی طرح ہو جو کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ اس میں کوئی فرق و امتیاز نہ ہو کہ گمشدہ چیز اس کے ہاتھوں ظاہر ہو جائے یا اس کے فریق کے ہاتھوں۔ تلاشِ حق میں اپنے فریق کو اپنا مددگار اور رفیق سمجھے نہ کہ فریق و مخالف اور جب اپنے رفیق کی رہنمائی سے غلطی واضح اور حق ظاہر ہو جائے تو اس کا شکریہ ادا کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور ایک مسئلہ کی بابت حکم دریافت کیا۔ حضرت علیؓ نے جواب عنایت فرمایا، جواب سن کر اس شخص نے کہا، اے امیر المؤمنین! اس مسئلہ کا حکم جو آپ نے بتایا وہ شاید صحیح نہیں۔ میرے خیال میں اس کا حکم یہ ہونا چاہیئے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا: ہاں تم نے صحیح کہا، مجھ سے غلطی ہوگئی وفوق کل ذی علم علیم۔ (یوسف ۷۶) اور ہر علم والوں سے بڑھکر ایک بڑا علم والا ہے۔

ذرا غور کیجیئے! حق کے اعتراف اور سچائی کے احترام کی یہ کس قدر روشن مثال ہے۔ اس کے ساتھ کچھ دیر کے لئے آپ اپنے زمانہ کے مناظرین کا جائزہ لیجیئے کہ اپنے فریق کی زبان سے جب حق واضح ہو جاتا ہے تو وہ کس قدر چراغ پا اور برہم ہو جاتے ہیں اور حق کی تکذیب میں پوری طاقت صرف کر دیتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ اُسے عمر بھر اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بناتے ہیں۔

کسی حکمت شناس بزرگ اور عالمِ دین کا یہ ملفوظ کس قدر صحیح اور صداقت پر مبنی ہے، فرماتے ہیں:

"جب لوگ علم حاصل کرلیں لیکن عمل ترک کر دیں، زبان سے اظہارِ محبت تو کریں، لیکن دل سے بغض و کینہ اور عداوت رکھیں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتے ہیں اور ان کی قوتِ بصیرت سلب کر لیتے ہیں۔"

شبہات کی تخم ریزی

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسانیت اور تمام بنو آدم میں شک وریب، شبہات اور وساوس کی تخم ریزی صرف شیطانِ مردود ہی کی کارستانی ہے، جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ مختلف گمراہ فرقوں کے یہاں جو شبہات پائے جاتے ہیں، جن کی بنیاد پر ان فرقوں نے راہِ حق سے انحراف کیا ہے، ان سب کا سرچشمہ یہی شیطانی شبہات ہیں۔ ممکن ہے نوعیت اور انداز کا فرق ہو شبہات کی راہیں مختلف ہوں۔ زیغ وضلال کا پیرہن ایک دوسرے سے جدا ہو، لیکن بحیثیتِ مجموعی تمام گمراہیاں، ان ہی شیطانی شبہات کی پیدا کردہ ہیں، شیطنت اور شبہات کی یہ راہ اس لئے پیدا ہوئی کہ شیطان نے نصِ شرعی (حکمِ الٰہی) کے مقابلہ میں اپنی رائے کو اصل سمجھا اور امرِ الٰہی کی مخالفت میں خواہشاتِ نفس کی پیروی کو ترجیح دیا۔

چنانچہ غور کیجئے کہ انبیاء علیہم السّلام سے ان کی اقوام نے جو بحث ومناقشہ کیا ہے وہ بعینہٖ ملعونِ اول شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی اور تقلید ہے، کج فہمی اور انانیت وتکبر کا جو سبق شیطان نے پڑھایا تھا، اقوامِ انبیاء نے اسی سبق کا اعادہ کیا ہے، قرآنی آیات کے تقابل سے یہ بات بالکل واضح ہے اور ان کا باہمی فکری ربط عیاں

ہو جاتا ہے، جیسے ان لوگوں نے کہا تھا :

أبشر یھدوننا۔ کہ کیا انسان ہم کو ہدایت کریں گے۔

(التغابن : ٦)

شیطان نے کہا تھا :

ءَ اسجد لمن خلقت طیناً۔ کہ کیا میں اس کے آگے جھکوں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے۔

(الاسراء : ٦١)

شیطان کا دعویٰ تھا :

انا خیر منہ، خلقتنی مِن نارٍ وخلقتہٗ مِن طین

میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اُسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔

(الاعراف : ١٢)

اقوامِ انبیاء کا دعویٰ اس طرح تھا :

انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین۔

تو (بھلا بتاؤ) کہ کیا میں افضل (نہیں) ہوں اس شخص سے جو بے وقعت ہے، اور بولنا تک اسے نہیں آتا۔

(الزخرف : ٥٢)

اسی طرح اگر ہم پچھلے زمانہ کے اہلِ بدعت اور دین بیزار لوگوں کے اقوال کا مزید جائزہ لیں تو اگلوں اور پچھلوں کے درمیان فکری ہم آہنگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے، جس کی طرف قرآنِ مجید نے اشارہ کیا ہے :

کذٰلک قال الذین من قبلھم مثل قولھم تشابھت قلوبھم قد بینا الآیات لقوم یؤمنون۔ (البقرۃ : ١١٨)

اسی طرح وہ لوگ کہہ چکے ہیں جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہیں کا سا کہنا ان کے قلوب متشابہ ہو گئے۔ ہم نے اپنے نشان تو کھول کھول دیئے ہیں ان لوگوں کیلئے جو یقین رکھتے ہیں

اور حدیث میں فرمایا گیا:

لتتبعن سنن الذین من قبلکم شبرا بشبر او ذراعا بذراع حتی لو سلکوا جحر ضب لسلکتموہ۔ (۱)

یقیناً تم لوگ اپنے سے پہلے لوگوں کی روش کو اپناؤ گے اور ضرور ان کے شانہ بشانہ چلو گے۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کی بل میں داخل ہوں تو تم بھی ایسا ہی کرو گے۔

اس مشابہت کی بہت سی مثالیں مسلمانوں کے بعض فرقوں اور جماعتوں کے افکار و تصورات اور ان کے اقوال میں ملتی ہیں۔ مثلاً آپ خوارج کے اس قول "لا حکم الا للہ ولا نحکم الرجال" (فیصلہ اور حکم صرف اللہ کا ہے، ہم لوگوں کو حکم نہیں بناتے) اور ابلیس کے اس تصور میں کوئی فرق و امتیاز محسوس کرتے ہیں؟!

قال لم اکن لأسجد لبشر خلقتہ من صلصال من حمأ مسنون؟! (الحجر: ۳۳)

بولا میں وہ نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ان سب کا حال یہی ہوا کہ جب اعتدال و توازن کو انہوں نے نظر انداز کیا تو افراط و تفریط کا شکار ہو گئے۔ معتزلہ نے توحید کے معاملہ میں کچھ اس قدر غلو کیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار ہی کر بیٹھے، اہل تشبیہ نے توحید میں اس قدر تفریط سے کام لیا کہ انہوں نے خالق کو اجسام و مخلوقات سے متصف کر دیا۔ تحکیم کے مسئلہ پر روافض اتنا آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے لوگوں کو اپنا معبود بنا ڈالا، اور خوارج نے ایسی تفریط برتی کہ انہوں نے انسان کو حکم بنانے ہی کی نفی کر دی۔

---

(۱) صحیح الجامع الصغیر ۴۹۳۹۔

آج اسلام اور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی آزمائش خود دین کا کام کرنے والوں کی دانستہ یا نادانستہ بے اعتدالی اور بے راہ روی سے ہے۔ پس زیادہ صحیح مسلک وہی ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد صحابۂ کرام، تابعین و اولیاءِ عظام اور علماء و محدثین کا مسلک ہے۔

سنّت و بدعت

اس بات سے ہر مسلمان واقف ہے کہ اسلام میں بلکہ ہر آسمانی مذہب میں اہلِ بدعت کا انجام بہت بُرا ہے، سلفِ صالحین کے طریقِ زندگی کو اپنانا اور ان کی روشن ہدایات پر عمل پیرا ہونا ہی وہ حقیقت ہے جس سے مسلمان ہدایت یافتہ ہو سکتے ہیں۔ خدا کے دین میں ہر وہ زیادتی اور بدعت جس کی کوئی اصل نہ ہو، ہوا و ہوس کے دھارے میں بہہ کر لوگ اُسے بہتر سمجھتے ہوں خواہ اس بدعت سے تصورِ دین میں کمی پیدا ہو یا زیادتی، یہ ایک ایسی ضلالت اور گمراہی ہے جس کے خلاف نبرد آزما ہونا — اور انتہائی مؤثر وسائل کے ذریعہ اس کا خاتمہ کرنا نہایت ضروری ہے لیکن یہ بات اصحابِ دعوت کے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ سنت و بدعت کے مسائل، اسلامی احکام کے نہایت پیچیدہ مباحث میں سے ہیں جن کے بارے میں سرسری نگاہوں سے فیصلہ مشکل ہے بلکہ اس کے لئے گہری نظر اور پختہ عزم کی ضرورت ہے، سلف میں ایسی کئی قد آور شخصیتیں ہیں جو اس باب میں لڑ کھڑا گئیں۔ یہ مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے جس میں عقل صحیح ڈھنگ سے کام نہیں کرتی اور فہم و فراست افراط و تفریط کا شکار ہو جاتی ہے۔

بدعت کی صحیح اور متوازن تعریف کیا ہے؟ اس سلسلہ میں ایک عرصہ

سے علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بدعت کی کتنی قسمیں ہیں؟ اُن چیزوں کا کیا حکم ہے جن کے بارے میں براہِ راست دین میں کوئی اصل نہیں ہے؟ اس عمل کا کیا حکم ہے جس کو آنحضرتؐ نے ترک کر دیا ہو، حقیقی بدعت اور مصلحتِ عامہ پر مبنی مسائل کے درمیان واضح فرق کیا ہے؟ اور کیا زمانہ اور تقاضائے زمانہ کے تغیر سے بدعت کے حکم میں کوئی تغیر ممکن نہیں؟ سنت و بدعت سے متعلق یہ تمام بحثیں ہیں، جن پر کافی غور و خوض کے باوجود علماءِ کرام کی آراء شدید اختلاف رکھتی ہیں، مختلف امور میں لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف کو دور کرنے کے لئے سنت و بدعت کے معیار کی تحدید کسی طور ممکن نہیں۔ کیوں کہ عام لوگوں کے نقطہ ہائے نظر اصول سازی سے زیادہ تطبیق میں مختلف ہوتے ہیں۔

اس لئے دعوت کا کام کرنے والے بھائیوں کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلہ میں نہایت محتاط رہیں اور کسی چیز پر مطلق بدعت جس پر سخت وعید ہے کا حکم لگانے سے پرہیز کریں، سوائے اس کے کہ کسی چیز میں بدعت کی صحیح حقیقت سامنے آجائے اور اصولِ دین کی روشنی میں کسی عمل کا بدعت ہونا ثابت ہو جائے تو اس وقت بدعت کا حکم لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ ایک مسلمان جس کا خون اور جس کی آبرو قابلِ احترام ہے کی نسبت گمراہی اور جہنم کی طرف کرنا بہت بڑی اور بُری بات ہے۔

بعض اہلِ علم اور دیندار لوگ بعض ایسے کام کرتے ہیں جنکی نسبت آنحضورؐ کی طرف غلط طور پر کی گئی ہو، لیکن وہ ان چیزوں کو صحیح سمجھتے ہوئے اُن پر عمل کرتے ہیں، جہالت کی وجہ سے بدعت اختیار کرنے کے باوجود ایسے لوگ اپنے نیک ارادے کی بنیاد پر اجر پائیں گے تاہم وہ شخص جس

پر سنت واضح ہو چکی ہو اور کسی اہل علم سے یہ معلوم ہو گیا ہو کہ فلاں عمل بدعت ہے اس کے باوجود وہ سنت کے علاوہ کسی دوسرے عمل کو سنت سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے تو وہ گمراہ اور بدعتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ تمام مسلمان آپس میں مل بیٹھ کر حقیقت کا سراغ لگاتے اور خلوص و انصاف اور دوستانہ ماحول میں جس کے پیچھے حق کے اظہار کا جذبہ کارفرما ہو، تحقیق کر کے امت کو ان پیچیدہ مباحث سے نجات دلاتے، ہم ایسی ہر کوشش اور سعی و کاوش کا خیر مقدم کریں گے۔

یہ بات بھی ضروری ہے کہ ہم زیادہ تر توجہ لوگوں کو سنت کی دعوت دینے پر صرف کریں۔ بے جا طور پر ہم بحث و مباحثہ کا انداز نہ اپنائیں جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا کہ تم بدعات کے سلسلہ میں اہل بدعت سے بحث مت کرو اس لئے کہ ان کے یہاں ہر سوال کا جواب ہے بلکہ تم ان سے سنت کے بارے میں دریافت کرو، اس لئے کہ وہ سنت سے واقف نہیں ہیں۔

یاد رکھئے ——— ! نرم روی اور ہمدردی کے ساتھ سنت کا تعارف ہی بحث و اختلاف کی بنیاد کو ختم کر سکتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس قوم میں اختلاف کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے تو وہ تباہی، ناکامی اور زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔

امام کی اقتدار کا مسئلہ

مقتدی کا اپنے امام کے اعتقادات اور مسلک سے واقف ہونا یا اس کی تحقیق کرنا، اقتدار کیلئے شرط نہیں ہے۔ بلکہ کسی مستور الحال شخص (یعنی جس کا مسلک اور جماعتی رجحان مخفی ہو یا اس کا عیب و ہنر واضح نہ ہو) کے پیچھے بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

ایک مسلمان جب مسلمانوں کے کسی شہر میں جائے تو اسے اُن مسلمانوں کے ساتھ جمعہ اور جماعت میں شریک رہنا چاہیئے، ان مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھے، دشمنی کا جذبہ نہ رکھے، ان مسلمانوں میں کوئی گمراہ اور بے دین ہو اور اس کے لئے صحیح راستہ کی رہنمائی کرسکتا ہو تو کرے ورنہ پھر اس اصول کو ذہن میں رکھے لایکلف اللہ نفسًا الّا وسعہا (اللہ کسی کو حسبِ استطاعت تکلیف دیتا ہے) مسلمانوں کی امامت کے منصب پر شرعی لحاظ سے کسی افضل شخص کا تقرر کرسکتا ہے تو کرے۔ اہلِ بدعت اور فسق و فجور کے مرتکب لوگوں کو منع کرنے کی ہمت و طاقت اور حوصلہ رکھتا ہو تو منع کرے، ورنہ پھر قرآن و حدیث سے زیادہ واقف اور طاعات پر عمل آوری میں سبقت کرنے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا بہتر اور افضل ہے ——— لیکن عام مسلمانوں کی اجازت اور مرضی کے خلاف کسی دوسرے امام کا تقرر عمل میں آیا ہو اور اس کے پیچھے

نماز پڑھنے میں کوئی شرعی رکاوٹ درپیش نہ ہو تو ایسی صورت میں اس امام کے پیچھے نماز کا ترک کرنا اور جمعہ و جماعت سے پیچھے رہنا، جہالت اور ضلالت متصور ہوگی اور بدعت کا بدعت کے ذریعہ رد و انکار لازم آئے گا۔

کسی فاجر امام کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کرنے والے شخص کی بابت علماء میں اختلاف ہے کہ اس کی نماز قابلِ اعادہ ہے یا نہیں؟ علماء کی ایک بڑی جماعت نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ اور امام احمد بن حنبلؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ نماز کا اعادہ کرنے والا مبتدع (بدعتی) ہے، اس لئے کہ صحابۂ کرامؓ جب اہلِ بدعت میں سے کسی کے پیچھے نماز پڑھتے تو نماز کا اعادہ نہیں کرتے تھے۔

فقہ کے چاروں مکاتب سے وابستگی رکھنے والے اور نہ رکھنے والے تمام مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں، جیسا کہ صحابہ و تابعین اور ائمۂ اربعہ و دیگر علماء و فقہاء کا معمول تھا کہ وہ بعض جزوی اور فروعی مسائل میں اختلاف رائے رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، کسی امام یا کسی عالم و فقیہ نے یہ نہیں کہا کہ فلاں شخص فلاں کے پیچھے نماز نہ پڑھے ورنہ وہ گمراہ اور مبتدع (بدعتی) ہوگا۔ بلکہ سلف کے اس طرزِ عمل کا انکار کرنے والا مبتدع ہوگا اور اس کا یہ عمل قرآن و حدیث اور دین و شریعت کے عمومی مزاج و مذاق کے خلاف ہوگا۔

صحابہ و تابعین اور ائمۂ سلف کی زندگی میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ صحابہ میں کچھ لوگ وہ تھے جو نماز میں بسم اللہ بآوازِ بلند پڑھنے کے قائل تھے اور بعض لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے، کچھ وہ تھے جو فجر کی نماز میں دعاءِ قنوت پڑھتے تھے اور کچھ لوگ نہیں پڑھتے تھے مثلاً

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام شافعیؒ اور ان کے متبعین مدینہ میں مالکی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے جب کہ مالکیہ کے یہاں نماز میں بسم اللہ نہ سرّاً (آہستہ) پڑھنا مطلوب ہے، نہ جہراً (باآوازِ بلند) جب کہ نماز میں بسم اللہ فقہِ حنفی میں سرّاً اور فقہ شافعی میں جہراً پڑھنا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید نے پچھنا لگایا اور نماز پڑھائی جس سے امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق نماز ہو جاتی تھی، امام ابو یوسفؒ کے یہاں پچھنہ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن آپؒ نے انہیں کے پیچھے نماز ادا کرلی۔

امام احمدؒ کے یہاں نکسیر ناقضِ وضو ہے لیکن امام مالکؒ کے یہاں اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، کسی صاحب نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ کیا آپ ایسے شخص کی امامت میں نماز ادا کریں گے جس کی نکسیر پھوٹ گئی ہو؟ امام احمدؒ نے فرمایا کیا میں سعید ابن المسیب اور امام مالکؒ کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا؟ (۱)

ہاں یہ بات جائز ہے کہ آدمی ایسے شخص کے پیچھے نماز نہ پڑھے جو مشرکانہ اعمال میں ملوث ہو اور جو قبر پرستی کا خوگر ہو اور اپنی جبینِ نیاز خدائے بے نیاز کے سامنے جھکانے کی بجائے اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے جھکاتا ہو اور اپنے اس طرح کے مشرکانہ اعمال سے اسلام کے پاکیزہ تصورِ توحید کو داغدار بناتا ہو۔ تاہم یہ اسی وقت ہے جب کہ اس کے مشرکانہ عقائد و اعمال کا تحقیقی طور پر علم ہو، اس لئے کہ خدا کے یہاں شرک سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ــــ

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۲۳/۳۷۴۔

اللہ تعالیٰ کے ذاتی اور صفاتی نام

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ (الاعراف: ۱۸۰)

اللہ ہی کیلئے اچھے اچھے مخصوص نام ہیں، سو انہی سے اُسے پکارو۔

اللہ تعالیٰ کا ہر نام ایک خاص عبودیت اور شانِ الوہیت کا مظہر ہے جس سے انسان اپنے خالق و پالنہار کی طرف والہانہ اور عاشقانہ انداز میں متوجہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ آیت میں "دعا" کا جو مفہوم ہے، وہ بہت وسیع اور بامعنیٰ ہے، اس سے حمد و ثنا کی دعا بھی مقصود ہے، عبدیت و بندگی کی دعا بھی، ضرورت و حاجت کی دعا بھی مُراد ہے اور بخشش و عطا کی دعا بھی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے اسماء اور اپنی صفات کی معرفت کی تلقین کی ہے۔ اس کی تعریف بجالانے اور اظہارِ عبدیت کے مقدور بھر حصّہ کو پانے کی دعوت دی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام ہیں جس شخص نے ان ناموں کا ورد کیا وہ جنت میں داخل ہوگا" (۱)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء و صفات سے ہمیں اس لئے واقف نہیں

---

(۱) بخاری (فتح الباری ۱۷/۱۴۸)

کرایا کہ ہم انہیں اختلاف و مباحثہ کا موضوع بنالیں (۱) بلکہ ان اسماء و صفات کا مقصد اپنی زندگی کو ان کے انوار و برکات سے آراستہ کرنا اور ان کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ حکیم بتدریج نازل ہوتا رہا، صحابۂ کرام اسے بغور سنتے رہے۔ قرآن صفاتِ الٰہی کے تذکرہ سے معمور ہے، لیکن ان صفات کے مفہوم کی تعیین میں انہیں کبھی کوئی اشکال پیدا نہیں ہوا اور نہ کسی صحابی کے بارے میں یہ منقول ہے کہ انہوں نے قرآن کی اصل دعوت اور پیغام سے صرف نظر کرکے اپنے آپ کو اسماء و صفاتِ باری کی تہہ میں اُلجھادیا ہو۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام جو تمام مسلمانوں کے لئے اسوہ ہیں اور پوری امت میں جنہیں "کمالِ ایمان" کی سعادت حاصل ہے، ان لوگوں نے بہت سے مسائل و احکام میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا لیکن اللہ تعالیٰ کے افعال، اس کی صفات اور اسماء کے کسی مسئلہ میں انکے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے (۲)۔

علامہ مقریزیؒ فرماتے ہیں:

"حدیث نبویؐ کے مجموعوں پر جن لوگوں کی نظر ہے اور سلفِ صالحین کے آثار سے جو واقفیت رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ صحابۂ کرام کی کثرتِ تعداد اور ان میں اختلافِ طبقات کے باوجود کسی صحابی کے بارے میں یہ

---

(۱) دوسری صدی ہجری کے اوائل میں معتزلہ، خوارج وغیرہ مختلف گمراہ فرقے پیدا ہوئے جنہوں نے انہی آیات و صفات کو اپنی جولانگاہِ بحث بنایا، اسی کی طرف اشارہ ہے (مترجم)

(۲) اعلام الموقعین ۱/۴۹۔

بات نہیں ملتی کہ انہوں نے آنحضورؐ سے کسی ایسی چیز کا مفہوم و معنیٰ دریافت کیا ہو جسے خود قرآن مجید میں خدا نے اپنے نبی کی زبانی بیان کر دیا ہو، تمام صحابہؓ قرآن مجید کا فہم رکھتے تھے، اسماء و صفاتِ الٰہی کے سلسلہ میں گفتگو سے وہ ہمیشہ بچتے رہے، ان صحابہ کے یہاں توحید باری اور رسالت نبوی کے ثبوت و استدلال پر سوائے کتابِ الٰہی کے کوئی اور کتاب یا سند درکار نہیں تھی اور وہ فلسفیانہ موشگافیوں اور بحث و تکرار کی راہوں سے اپنا دامن بچائے رکھتے تھے(۱)"۔

صحابۂ کرام، تابعین اور ائمۂ عظام کا یہی طرزِ عمل رہا کہ انہوں نے ان باتوں کو بحث و تکرار کا موضوع نہیں بنایا اور نہ "آیاتِ صفات" کے مسئلہ پر دوسری صدی کے آغاز تک کوئی اختلاف و نزاع پیدا ہوا تاہم دوسری صدی ہجری میں کچھ ایسے فتنہ پرور اٹھے جنہوں نے اس طرح کے مباحث میں امت کو اُلجھا کر رکھ دیا۔

(حاصل یہ ہے کہ دین کے فروعی اور جزوی مسائل میں اپنی توانائی صرف کرنا دراصل اپنے آپ کو اساسِ دین سے دُور اور اسلام کی روح سے ناآشنا رکھنا ہے)۔

---

(۱) خطط المقریزی ۴/۱۸۰۔

•

موضوع کی مناسبت سے مناسب ہوگا کہ متکلم اسلام اور مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانی رح نے قرآنی آیت قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایاما تدعو فلہ الاسماء الحسنیٰ (اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جو کہہ کر پکارو گے سب اسی کے خاص نام ہیں) کے ذیل میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ اسے مطالعہ میں لے آیا جائے، علامہ عثمانی تحریر فرماتے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ صفحہ گذشتہ) "واقعہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ناموں میں سے مشرکین عرب کے یہاں اسم "اللہ" کا استعمال زیادہ تھا، اسم "رحمٰن" سے چنداں مانوس نہ تھے۔ البتہ یہود کے یہاں "اسم" "رحمٰن" بکثرت مستعمل ہوتا تھا، عبرانی میں بھی یہ نام اسی طرح تھا جیسے عربی میں دوسری طرف مسیلمہ کذاب نے اپنا لقب "رحمٰن الیمامہ" رکھ چھوڑا تھا۔ غرض مشرکین حق تعالیٰ پر اسم "رحمان" اطلاق کرنے سے بدکتے اور وحشت کھاتے تھے، چنانچہ جب حضور کی زبان سے "رحمان" سنتے تو کہتے کہ محمدؐ ہم کو دو خداؤں کے پکارنے سے منع کرتے ہیں، اور خود اللہ کے سوا دوسرے خدا (رحمٰن) کو پکارتے ہیں، یہود کو یہ شکایت تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں رحمٰن کا ذکر ایسی کثرت سے کیوں نہیں ہوتا جس طرح ہمارے یہاں ہوتا ہے، دونوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا کہ "اللہ" اور "رحمٰن" ایک ہی ذات منبع الکمالات کے دو نام ہیں، صفات و اسماء کے تعدد سے ذات کا تعدد لازم نہیں آتا، جو یہ چیز توحید کے منافی سمجھی جائے، رہی یہ بات کہ کسی ایک نام کا ذکر کثرت سے کیوں نہیں ہوتا تو سمجھ لو کہ اللہ کے جس قدر اسماء حسنیٰ ہیں، ان میں سے کوئی نام لے کر پکارو مقصود ایک ہی ہے، عنوانات و تعبیرات کے تنوع سے معنون نہیں بدلتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد، ؎

عبارتنا شتی وحسنك واحد

وكل إلى ذاك الجمال يشير

(اضافہ از مترجم)

ائمہ کے اختلاف کی حقیقت

ائمہ مجتہدین، بالخصوص امام ابوحنیفہؒ کے ابتدائی زمانہ میں علماء کی ایک جماعت وہ تھی جس کے یہاں خبر واحد (اور امام شافعیؒ کی اصطلاح میں "خبر خاصہ") کے ذریعہ پہنچنے والی حدیثیں بعضوں کے نزدیک ناقابلِ استدلال قرار پائیں، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مختلف طبقوں اور جماعتوں کی طرف سے غلط باتیں منسوب کی جارہی تھیں۔ صحیح حدیث اور بے بنیاد روایتوں میں فرق و امتیاز نہیں تھا، حدیث کی پہچان اور معیار حدیث کے اصول وضوابط وضع نہیں کئے گئے تھے۔ نیز صحیح حدیثوں اور مستند روایتوں کا کوئی مجموعہ بھی اس وقت تک سامنے نہ آسکا تھا اس لئے علماء نے کسی بھی مسئلہ میں خبر واحد سے استدلال کو ناکافی قرار دیا تاکہ کوئی غلط بات آنحضورؐ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے اور عام مسلمانوں کا حدیث و سنت کے سلسلہ میں تمام تر اعتبار و اعتماد فقہاء و محدثین پر ہی تھا۔ فقہاء میں امام ابوحنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے خبر واحد کو قبول کیا اور اس سے استدلال فرمایا۔ جن لوگوں نے مسند امام ابوحنیفہؒ، اور امام ابویوسف و امام محمد رحمہما اللہ کی کتاب الآثار کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔

لیکن امام ابوحنیفہؒ قبول حدیث کے لئے مطلوب اپنے اصول و ضوابط میں بڑے سخت تھے، قبولِ حدیث کے لئے ان کے یہاں ایک شرط یہ بھی ہے کہ

حدیث کی روایت کرنے والے میں "ثقاہت" کے ساتھ ساتھ "ضبط" بھی ہو (ضبط کا مفہوم یہ ہے کہ حدیث کی روایت کرنے والے نے حدیث کو اچھی طرح محفوظ کرلیا ہو اور وہ قوی الحافظہ ہو یا کسی کتاب میں لکھ لیا ہو) لیکن امام صاحب کے یہاں ضبط کے مفہوم میں اس کا فقیہ ہونا بھی داخل ہے، یعنی راوی کا قوی الحافظہ ہونا اور حدیث کا محفوظ رکھنا ہی مطلوب نہیں بلکہ راوی کیلئے اس روایت کا سمجھنا بھی شرط ہے، اسی لئے امام ابوحنیفہؒ کے یہاں جہاں روایات میں ترجیح کی نوبت آتی ہے وہاں فقیہ راویوں کی روایت کو ترجیح دی جاتی ہے اور بہت کم ایسے راویوں کی روایت راجح قرار پاتی ہے جو تفقہ اور اجتہاد میں معروف نہ ہوں (۱) خود بعض صحابۂ کرام بھی خبر واحد کو دین وشریعت کے ثابت شدہ اصول واحکام کے مقابلہ میں رد کردیا کرتے تھے اور ناقابلِ قبول قرار دیتے تھے، جیسے حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کو رد فرمادیا جس میں فرمایا گیا:

ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ۔ میت پر اسکے اہل وعیال کے رونے سے اسے تکلیف دی جاتی ہے۔

کہ جزاء ومکافات کے سلسلہ میں قرآن نے جو اصول بتائے ہیں یہ اس کے خلاف ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کی آیت:

لا تدرکہ الابصار (الانعام ۱۰۳) اسکو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی۔

کے مفہوم ومعنی کی روشنی میں آپؓ نے حدیث کو رد فرمادیا جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رویتِ باری کا ثبوت ہے۔

فقہاء مدینہ کے سرخیل امام مالکؒ نے بھی بعض ایسی حدیثوں کو (جو خبرِ

---

(۱) کشف الاسرار للبزدوی ۲/۹۹۰۔

واحد کے زمرہ میں ہیں) بعض اصولِ قطعیہ کے مخالف ہونے کی بنیاد پر ترک فرمادیا ہے جیسے قرآن مجید کی آیت :

فکلوا ممّا امسکن علیکم (۱) سو کھاؤ اس (شکار) کو جسے (شکاری جانور) تمہارے لئے پکڑ رکھیں

کی روشنی میں وہ حدیث رد فرمادی جس سے کتے کے برتن میں منھ ڈالنے کی وجہ سے اس کا ناپاک ہونا معلوم ہوتا ہے۔ گو ہمیں صحیح اور مستند خبرِ واحد کی، عقائد اور فروعی احکام کے باب میں حجیت پر یقین و اعتماد ہے لیکن حدیث و سنت کی ایک بڑی تعداد جس سے اصحابِ حدیث، اہلِ رائے کے خلاف استدلال کرتے ہیں وہ خبرِ واحد ہی کے درجہ کی ہے جو قرنِ اول میں صحابہ کے مختلف شہروں اور ملکوں میں پھیل جانے یا بعض صحابہ سے ان حدیثوں کے خلاف روایات منقول ہونے کی بنا پر اہلِ علم کے درمیان معروف نہیں تھیں (۲)

ان کا خیال تھا کہ ان حدیثوں کا تعلق خاص مسائل اور مخصوص حالات سے تھا انہیں کوئی عمومی تشریعی حیثیت حاصل نہیں تھی، بلکہ وہ انفرادی نوعیت کے سوال پر مستفتی کے خصوصی حالات کے پیشِ نظر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور فتاویٰ ہیں جیسے حضرت طلق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا کیا مسِ ذکر (شرمگاہ چھونے) سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا انما ھو بضعۃ منک (۳) وہ تمہارے جسم ہی کا ایک حصہ ہے یعنی جس طرح جسم کے اور حصوں کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا اسی طرح اس مسئلہ میں بھی وضو نہیں ٹوٹتا اس کے برخلاف حضرت بسرہؓ سے منقول حدیث میں وضو کرنے کا حکم دیا

---

(۱) المائدہ : ۴۔

عہ دیکھئے رفع الملام عن ائمۃ الاعلام (ابن تیمیہؒ)

(۲) مقدمۃ المغنی (شیخ رشید رضا) ص : ۱۸۔

(۳) مسند احمد۔

گیا ہے (۱)، یہاں اصحابِ حدیث میں محققین حضرت بسرہؓ کی حدیث کی ترجیح کے قائل ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اعتقادات اور اساسی احکام چوں کہ قطعی دلائل سے ثابت ہیں اس لئے ان میں ائمہ مجتہدین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اختلاف محض ان چند فروعی احکام میں پایا جاتا ہے جن کے بارے میں کوئی ایسی نص موجود نہیں جو قطعی ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہو۔

کسی مسئلہ میں علماء کا اجماع یقینی حجت ہے۔ اہلِ دانش کا اختلاف بھی یقیناً رحمت اور فراخی وکشادگی کا باعث ہے۔ اس لئے کہ فروعی اور عملی مسائل میں اختلاف سے لوگوں کیلئے سہولت اور آسانی کی راہیں نکل آتی ہیں۔

اَب اگر انسان مجبور ہو، عذر درپیش ہو تو اس رائے پر عمل کرلے جس میں آسانی ہو، ورنہ عام حالات میں اس رائے پر عمل کرلے جس میں احتیاط ہو اور جو دلائل کے اعتبار سے زیادہ قوی اور واضح ہو (۲)۔

---

(۱) صحیح الجامع الصغیر (۶۴۳۰)

(۲) الجواہر الکلامیۃ (شیخ طاہر الجزائری) ص: ۵۸۔

امّت کا اختلاف اور ائمہ کا کردار

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مؤمنین کو باہمی رشتہ و تعلق کی بنیاد پر ایک جسم کے اعضاء سے تشبیہ دی اور انہیں "ایک جاں، ایک قالب" قرار دیا ہے۔ اللہ کے انکار اور عقیدہ کے فساد کے بعد اختلاف و نزاع سے بڑھ کر کوئی اور چیز انہیں ناپسندیدہ نہیں تھی۔ خواہ اختلاف کسی معمولی بات پر ہی کیوں نہ پیدا ہوا ہو۔ چونکہ فہم و رائے اور فکر و خیال میں اختلاف ایک طبعی اور فکری بات ہے جس کی طرف قرآن مجید میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

ولا یزالون مختلفین الا من	لیکن وہ اختلاف ہی کرنے والے ہمیشہ رہیں گے
رحم ربك ولذلك خلقهم۔	بجز اس کے جس پر آپ کے پروردگار کی رحمت
(ھود: ۱۱۸)	ہو اور اسی لئے اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔

اس لئے اختلاف کی گنجائش اور اس کے امکان کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن دینی نقطۂ نظر سے وہ اختلاف مذموم اور قابل نفرت ہے جو تفریق و انتشار کا سبب ہو۔ دلوں کو جوڑنے کی بجائے توڑنے کا ذریعہ ہو، سلف صالحین کا طرزِ عمل اس سلسلہ میں بہت محتاط اور قابل تقلید رہا ہے چنانچہ انہوں نے دین کی بنیادی مسلمات اور عقائد و اصول میں رائے زنی اور مداخلت کو ممنوع قرار دیا۔ عقائد کے باب میں جس قدر تفصیلات،

دین وشریعت کے مزاج شناس صحابہؓ و تابعین اور علماء و محدثین سے منقول ہیں، ان ہی کو بغیر کسی تاویل کے قبول کرنا اور ان پر عمل پیرا ہونا، ہمارے ائمۂ سلف کی مزاجی خصوصیات کا ایک حصہ ہے۔ انہوں نے علمی اجتہاد کو اس باب میں بالکل راہ نہیں دی بلکہ اس کو صرف دین کے عملی احکام، بالخصوص معاملات تک محدود رکھا، غرض کہ ان کی پوری زندگی وحدت و اتفاق کا عملی نمونہ تھی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اتفاقی مسائل میں وہ باہمی تعاون کرتے اور اجتہادی مسائل میں اگر کوئی اختلافی صورت پیدا ہو جائے تو ایک دوسرے کے لئے معذرت خواہ ہوتے۔ اپنے مخالف کو اپنی رائے اور فکر کے قبول و فہم پر مجبور کرنا اور اپنے مسلک پر دوسرے کو زبردستی آمادہ کرنا ہرگز ان کا شعار نہ تھا۔

لیکن آج کیا صورتحال ہے؟ ان نیک نفس و پاک طینت سلف کے خلف میں تعصب اور بغض و عناد کو کس نے راہ دی؟ کیا اس جاہلانہ تعصب اور مسلک و مشرب کے کسی معمولی اختلاف کو تشدد کا انتہا پسندانہ اور سخت گیر رخ دینے کا کوئی جواز ہے؟ محض اجتہادی آراء کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے درمیان تفرقہ و انتشار کی فضا پیدا کرنے اور ایک دوسرے کے لئے ایذاء و تکلیف کا سبب بننے کا سلف صالحین کے عمل سے کیا جوڑ ہے؟ وہ سلف جن کی اجتہادی آراء کا مقصود یہ تھا کہ اللہ کی شریعت میں یسر و سہولت کی جو راہ بتائی گئی ہے، اسے اپنایا جائے اور تنگی و حرج سے بچا جائے۔ آج کے زمانہ کے موجودہ تعصب اور پچھلے زمانہ کے سلف صالحین کے اس پاکیزہ طرز عمل کے درمیان کیا نسبت ہے۔ اپنے اجتہاد اور غور و فکر سے وہ ایسی رائے اختیار کرتے جس

میں شرعی حکمت و مصلحت کا پاس و لحاظ بھی ہو۔ اور مسلمانوں کے درمیان تفریق کا سبب بننے سے احتراز بھی۔ یہاں تک کہ مشہور و قدآور ائمہ بھی اجتہاد کے باب میں قطعی طور پر حکم دینے سے احتراز کرتے تھے بلکہ ایک گونہ کمزور لفظوں میں یہ کہتے "میں اسے ناپسند سمجھتا ہوں" یا "میں اسے بُرا جانتا ہوں" یا "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ بات پیدا نہ ہو جائے" یا یوں کہتے کہ "یہ مناسب نہیں" یا "یہ بہتر نہیں" یا "مجھے یہ بات پسند نہیں" یا "میں اسے بہتر نہیں سمجھتا" یا اس طرح جواب دیتے کہ "سائل و مستفتی کو اس معاملہ میں احتیاطاً اس طرح کرنا چاہیئے" یا "میری رائے میں وہ اسطرح کرے" یا "یہ زیادہ احسن و بہتر ہے" ——— حضرت سیدنا امام احمد بن حنبل سے اجتہادی مسائل اور غیر منصوص احکام یا کسی طرح کی توجیہ و احتمال رکھنے والی نصوص میں غایت درجہ احتیاط منقول ہے اور مذکورہ بالا اسلوب بیان کی نظیریں ان کے یہاں بکثرت ملتی ہیں۔

ائمہ مجتہدین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی شخص نے کسی ایسی حدیث کی مخالفت کی جو اس تک نہیں پہنچی، یا کسی ایسے مضمون حدیث کی مخالفت کی جس کا مفہوم و معنی قطعی نہ ہو اور حقیقی مفہوم تک اس کی رسائی نہ ہوئی ہو یا کسی مسئلہ میں اس نے شریعت کے مقصود کو سمجھنے کی پوری کوشش کی بالآخر اپنے فہم اور ترجیحی رائے کے مطابق عمل کیا لیکن وہ عمل اور اس شخص کا فہم غلط ثابت ہوا تو ایسا شخص معذور سمجھا جائے گا ——— جب یہ بات طے ہے تو پھر ایک مجتہد کسی دوسرے مجتہد کی رائے کی مخالفت کرے تو وہ کیوں کر "خطاکار" ٹھیرے؟

خلاصہ یہ ہے کہ مسلک و مذہب اور فکر و رائے کے اختلاف

کے ذریعہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنا اور دین کے بنیادی اصول یا شریعت کے فروعی اور جزوی مسائل میں کسی بھی جماعت کا اپنے مسلک و مذہب کی صحت و صداقت کے اثبات میں سخت رویہ اپنانا، قرآن و حدیث سے ثابت شدہ نصوص کے مطابق گناہ کبیرہ ہے۔

ان ہی اصولوں کی روشنی میں مسلمانوں کی ہر جماعت اور ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اختلاف و تفرق کی تمام بنیادوں کو زیر زمین پیوست کر دیں ——— ایک موقع پر امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اپنی تصنیف "القسطاس المستقیم" میں وحدت و اجتماعیت کے تحفظ و بقاء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کا اپنے متفق علیہ مسائل پر عمل کر لینا ہی کافی ہے۔ اختلافی مسائل کو نظر انداز کرنا بلکہ انہیں بھلا دینا، ——— اور اس طرح کے مسائل میں طبعی طور پر پیدا ہونے والی شکر رنجی اور اختلاف کو امتِ اسلامیہ میں بعض و عداوت اور کینہ و کدورت کا ذریعہ نہ بنانا ہی دینی حکمت و اجتماعی مصلحت کے عین مطابق ہے۔ کیوں کہ ہماری امت وہ امت ہے جو وحدت و اجتماعیت کی داعی اور امین ہے اور جسے اسلامی باہمی اتحاد، الفت اور برادرانہ محبت کا درس و پیغام اللہ کی کتاب اور رسول کی شریعت نے دیا ہے۔

دوستی اور دشمنی

دین کی بنیاد پر دوستی اور دین کی بنیاد پر دشمنی، ایک طے شدہ حقیقت ہے اور بالاتفاق شریعت میں مطلوب بھی، دین و مذہب کی اس معلوم حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۱)

جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، آپ انہیں نہ پائیں گے کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے پیمبر کے مخالف ہیں۔

⁂

دین کی بنیاد پر کسی کے ساتھ دوستانہ ربط و تعلق کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسرے کیلئے اپنی محبت خلوص پیار اور اپنائیت کا تحفہ پیش کریں، دوست کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوست کے غم کو اپنا غم سمجھیں، حدیث نبوی میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (۲)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے مؤمن بھائی کیلئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

---

(۱) المجادلۃ: ۲۲۔ (۲) البخاری (فتح ۱/۶۳)

اسی طرح دین کی بنیاد پر دوسرے کے ساتھ دشمنی کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کسی طرح دشمن کو دین کے خلاف سازش اور مکر و فریب کی سرگرمیوں میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ اگر اس سلسلہ میں آپ کے اندر قدرت ہے اور آپ کے لئے اس کام میں کوئی قابلِ ذکر رکاوٹ نہیں ہے تو آپ کو اس جانب ضرور اقدام کرنا چاہئے کہ یہ بھی حفاظتِ دین کی سعی و کاوش کا ایک حصہ ہے ——— لیکن یہ بات اس موقع پر بہر طور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ دوستی و دشمنی کی بنیاد محض دین اور مذہب ہو، کوئی ذاتی منفعت یا شخصی غرض اس سے وابستہ نہ ہو، ایک مؤمن سے آپ دوستی اس لئے رکھیں کہ وہ بھی اللہ پر ایمان رکھتا ہے، خدا کا دوست ہے اور کسی سے دشمنی اور عداوت ہو تو اس کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ ہو کہ وہ خدا کا دشمن، مذہب بیزار اور اللہ کا باغی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:———

من احب للّٰہ وابغض للّٰہ فقد استکمل الایمان (۱)

جس نے کسی سے اللہ کیلئے محبت اور دوستی رکھی اور اللہ ہی کیلئے بغض رکھا اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کی۔

دوستی و دشمنی کا یہ شرعی معیار برقرار نہ رہے، یعنی قرابت و رشتہ داری یا کسی سے کسی منفعت کے حصول کی خاطر دوستی کی یا کسی سے دشمنی اور بغض رکھا تو اس لئے کہ وہ خسارہ اور نقصان کا شکار ہو جائے اور کوئی ناگہانی آفت ٹوٹ پڑے ——— دوستی و دشمنی کا یہ انداز غیر مؤمنانہ اور محض دنیا پرستانہ ہے، جس کے لئے خدا کے یہاں اجر و ثواب کی کوئی ضمانت نہیں۔ دینی مفاد کو اپنی ذاتی منفعت پر ترجیح دینا ہی وہ اصل حقیقت ہے جو آدمی کو

---

(۱) صحیح الجامع الصغیر (۵۸۴۱)

رضاءِ الٰہی کا مستحق قرار دیتی ہے۔

اس تمہید کی روشنی میں کسی کافر یا فاسق سے مذہبی بنیادوں پر دوستی ناجائز اور حرام ہے، دنیوی امور و معاملات کے سلسلہ میں ربط و تعلق کی گنجائش تو ہے، تاہم ان میں بھی کچھ ایسی صورتیں ہیں جن پر شریعت نے نکیر کی اور ربط و تعلق کی راہوں کو ناجائز قرار دیا ہے۔

۱۔ اپنی گفتگو یا اپنے عمل کے ذریعہ کسی کافر و مشرک کی تعظیم و تکریم، کہ یہ ان قرآنی آیات کے منافی ہے جس میں فرمایا گیا کہ عزت و تکریم اللہ کیلئے بالذات مخصوص ہے، رسول کے لئے بربنائے رسالت اور مؤمنین کے لئے بربنائے ایمان۔ رہے کفار و فساق اور منافقین تو حقیقی عزت میں سرے سے ان کا کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔

ولیجدوا فیکم غلظۃ (التوبۃ: ۱۲۳)	کافروں کو تمہارے اندر سختی پانا چاہیے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (المنافقون: ۸)	عزت تو بس اللہ ہی کی ہے اور اس کے پیمبر اور ایمان والوں کی۔

کافر و فاسق کی تعظیم کرنا گویا اس کو اللہ کی ذات کیلئے مخصوص "عزت" میں شریک کرنا ہے اور جو شخص کسی کافر یا بدعتی کی تعظیم کرتا ہے وہ حضرت فضیل کے بقول اسلام کی عمارت ڈھانے میں شریک و معاون ہے۔

۲۔ کوئی ایسا کام کرنا یا ایسی بات کہنا جس سے کافر کو اپنے کفر اور فاسق کو اپنے فسق پر حوصلہ و ہمت اور تقویت ملتی ہو اور کفر و فسق کے لئے مدد اور تعاون کی شکل پیدا ہوتی ہو۔

۳۔ اسی طرح کافر کے لئے درازیِ عمر کی دعا بھی غیر شرعی اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

تاہم کسی مؤمن سے عداوت اور دشمنی رکھنا، خواہ دینی معاملہ میں ہو یا دنیوی کسی طرح جائز نہیں تاوقتیکہ اس کا فسق ظاہر نہ ہو، عداوت اور دشمنی کا مطلب وہ معمولی سی شکر رنجی اور طبیعت کا تنفر نہیں جس سے بہت کم لوگوں کے دل خالی ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت علیؓ اور بعض صحابہ کے درمیان حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ اور ان کے بھائی محمد بن الحنفیہ کے درمیان اور حضرت حسن بصری اور حضرت ابن سیرین کے درمیان طبعی طور پر تھوڑی سی اختلافی نوعیت کی نوک جھونک جاری رہتی تھی لیکن اسے عداوت اور دشمنی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ ان میں سے کوئی اپنے ساتھی کو ضرر پہونچانے اور تکلیف دینے کا سقصد نہیں رکھتا تھا بلکہ اپنی فکر و رائے کا اپنی بساط کے مطابق دفاع کرنا مقصود ہوتا تھا اسلئے اسے عداوت نہیں کہا جاتا

جس شخص کا ایمان اور حسن عمل لوگوں میں معروف ہو اور ظاہر حال کے اعتبار سے اس کا مسلمان ہونا اور سیرت و کردار کا اسلامی اقدار کے مطابق ہونا معلوم ہو، وہ ہر طرح کی عظمت و محبت اور عزت و احترام کا مستحق ہے۔ اس سلسلہ میں امام شافعیؒ کا یہ ارشاد نہایت قابلِ قدر اور بصیرت افروز ہے کہ "ہم کسی بھی شخص کے بارے میں اس کے ظاہر حال کے مطابق فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں، باطنی احوال اور پوشیدہ حقائق سے اللہ تعالیٰ ہی بخوبی واقف ہے"

اس لئے جس شخص کے ایمان کے بارے میں ظاہری احوال اور ایمانی تقاضوں کی روشنی میں آپ یقین نہ رکھتے ہوں، اس سے دوستی اور محبت رکھنا آپ پر لازم نہیں اور جس آدمی کے کفر اور فسق کے بارے میں آپ صحیح طور پر علم نہیں رکھتے، اس سے دشمنی اور عداوت رکھنا بھی جائز نہیں۔

ایمان کے تقاضے

احکامِ شریعت کے عملی نفاذ، حدودِ الٰہی کی پاسبانی، اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور مقرر کردہ سرحدوں کی حفاظت اور مختلف دینی امور کے سلسلہ میں باہمی تعاون و نصرت کے لئے مسلمانوں کا باہم معاہدہ کرنا، قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ایک مؤمن کے دوسرے مؤمن پر ایمانی رشتہ کے اعتبار سے جو حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انکی تکمیل کی شریعت میں تاکید کی گئی ہے ——— "اور یہ حقوق محض ایمان لانے اور اسلام قبول کرنے سے اپنے آپ واجب ہو جاتے ہیں۔ دائرۂ ایمانی میں داخل ہونے کے بعد لازمی طور پر ان حقوق کی تکمیل اسی طرح ضروری ہو جاتی ہے، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ فرائض کی ادائیگی لازم ہے۔ حقوق کی ادائیگی پر معاہدہ گویا اللہ کے احکام اور رسول کے ارشادات کی اطاعت کا معاہدہ ہے۔ نیز یہ حقوق ہر مؤمن کے دوسرے مؤمن پر ثابت اور طے ہے۔ خواہ باضابطہ دونوں کے درمیان عہد و پیمان کا معاملہ ہوا ہی نہ ہو" (۱)

خلاصہ یہ کہ وہ تمام شروط و معاہدات جو لوگوں کے درمیان طے پاتے ہیں، ان کے صحیح اور غلط ہونے اور جائز و ناجائز ہونے کے

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۱۱/۱۰۰ — ۱۰۱۔

بارے میں ایک ہی معیار ہے اور وہ ہے اللہ کا کلام اور رسول کے احکام و فرامین، لہذا ہر وہ شرط جو قرآن و حدیث کے بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ ہو، اس کو پورا کیا جائے گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"جس شخص نے کوئی ایسی شرط رکھی جو قرآن و حدیث سے متصادم ہو وہ باطل ہے، خواہ وہ اس طرح کی سو شرطیں کیوں نہ لگا دے۔ اسلئے کہ اللہ کی کتاب زیادہ سچی ہے اور اس کی شرط زیادہ مضبوط و با اعتماد ہے" (۱)۔

پس جو شرط اللہ اور اس کے رسول کی شرط کے خلاف ہو وہ باطل ہے، مثلاً کوئی اس بات پر معاہدہ کرے کہ اس کی ہر خواہش اور ہر ارادہ پر فریق ثانی اپنی رضامندی اور نصرت کا یقین دلائے اور اس کے ہر دشمن کے خلاف اپنی مدد پہنچاتا رہے، خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر، یا اس کے ہر حکم کو بجالانے کا عہد کرے، خواہ وہ حکم حق کے مطابق ہو یا باطل کے موافق۔ اس طرح کی کچھ مزید شرطیں رکھے، ان صورتوں میں آدمی ان ہی شرائط کی تکمیل کا پابند ہے جو حکم شریعت کے مطابق ہیں۔ منشاء شریعت کے خلاف کسی بھی شرط یا حکم پر عمل کرنا اپنے آپ کو حق و راستی کی راہ سے دور کرنا ہے۔ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے خرید و فروخت، ہبہ، نذر، وقف وغیرہ تمام معاملات اور کسی امام و مرشد کے ہاتھوں پر بیعت وغیرہ تمام مسائل کی شرائط میں یہی بنیادی اصول اور اساسی روح پائی جاتی ہے۔

ہر چیز میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور ہر چیز میں اللہ

---

(۱) صحیح بخاری (فتح ۶/۲۵۵)

اور اس کے رسول کی معصیت اور نافرمانی سے اجتناب، ہر شخص کے لئے ضروری ہے کیوں کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے نیز یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ کوئی شئ محبوب نہ ہو ——— اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والے ہی درحقیقت اطاعت گذار اور وفا شعار ہیں (۱)

جو آدمی ایمانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے وہ ہر مؤمن کا بھائی ہے۔ ہر مؤمن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بھائی کے حقوق کی ادائیگی کرتا رہے اگرچہ ان کے درمیان کوئی خاص معاملہ یا معاہدہ طے نہ پایا ہو (۲)

اگر دو آدمی اس طرح دوستی کا معاہدہ کریں کہ ان کا دوست ایک اور اُن کا دشمن ایک، خواہ وہ کوئی ہو، اس طرح کا معاہدہ غیر شرعی اور ناجائز ہے اس لئے کہ اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک فریق کا دشمن کوئی مسلمان ہو تو دوسرے فریق کو معاہدہ کے تحت لازمی طور پر اس مسلمان سے دشمنی رکھنی ہوگی، خواہ اس کا ذاتی طور پر کوئی تعلق ہو یا نہ ہو، اس طرح ایک مسلمان بھائی سے عداوت پیدا ہوگی جس کی شریعت میں مذمت کی گئی ہے۔

ایمان اور ایمانی رشتہ کی بنیاد پر ایک مسلمان سے جو حقوق وابستہ ہو جاتے ہیں ان کا تحفظ اور پاسداری اور ان ہی حقوق کے مطابق عمل آوری ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر اس میں خوبیاں ہیں تو ان کا اعتراف کیا جائے اور اچھائیوں پر تعریف کی جائے اور خوبیوں کی بنیاد پر ہی دوستی

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۳۵/۹۷۔

(۲) حوالہ سابق ۳۵/۹۴۔

اور تعلق رکھا جائے اور برائیاں پائی جاتی ہوں تو ان سے حتی الوسع روکا جائے کہ ثواب و سزا کے مستحق تمام ہی لوگ ہیں، نیکیوں پر ثواب اور اجر ہے تو برائیوں کے بدلہ میں عقاب اور سزا ہے ——— دوستی و دشمنی اور محبت و نفرت کا تعلق آدمی کے نیک و بد ہونے سے ہے، نیکی، محبت اور دوستی کا سبب ہے تو بدی، نفرت اور دشمنی کی موجب ہے، نیکی و بدی پر ثواب و سزا کے سلسلہ میں قرآنی تصوّر یوں ہے:

فمن یعمل مثقال ذرۃٍ خیراً یّرہ ومن یعمل مثقال ذرّۃٍ شرا یّرہ۔ (الزلزال: ۸-۷)

سو جو کوئی ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا، اسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرہ بھر بھی بدی کی ہوگی اسے بھی دیکھ لے گا۔

اہل سنت والجماعت کا مسلک یہی ہے، یہی مسلک معتدل اور متوازن ہے اور ہم بھی انشاء اللہ اہلِ سنت والجماعت ہی میں ہوں گے۔ جب کہ خوارج اور معتزلہ اور مرجئہ و جہمیہ کی آراء اس سے مختلف ہیں۔

علماء سے ربط

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے آدمی کا ہر عمل اور ہر حرکت و کردار اسلامی تعلیمات اور دینی تہذیب و تمدن کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اسلامی و دینی مسائل اور شرعی احکام میں رہنمائی کے لئے اہلِ علم اور علماء سے ربط پیدا کرنا چاہیئے۔

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون۔ (النحل: ۴۳)

اگر تمہیں کوئی بات معلوم نہ ہو تو اہلِ علم سے دریافت کرلو۔

مستقل طور پر حصولِ علم کے لئے درکار قدرت و وسائل اور استعداد و صلاحیت کی کمی یا زندگی کے مسائل سے فراغت و رخصت کے نہ ہونے یا پھر فقہ و تفقہ میں پوری قدرت نہ ہونے کی بناء پر یہ حکم ہے کہ اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اہلِ بصیرت اور اربابِ دانش سے پوچھ کر اپنے مسئلہ کا شرعی حل نکالنا چاہیئے۔ فقہ میں پوری بصیرت اور مکمل قدرت کی بات اس لئے کہی گئی کہ بہت سے لوگ علمِ فقہ تو رکھتے ہیں لیکن فقہی بصیرت و ذہانت نہیں رکھتے۔

جو مسلمان شریعت کے فرعی احکام میں غور و فکر کے مرتبہ تک ابھی نہ پہنچا ہو، وہ کسی ایک امام کی اتباع کرے اور بہتر ہے کہ اپنے امام کے دلائل سے واقفیت بھی حاصل کرتا رہے۔ سچے اور با اعتماد لوگوں

کے ذریعہ پہنچنے والی باتوں کو دلیل کی بنیاد پر قبول کرے۔ اور اگر کوئی ایسا مسلمان ہو جو علم و تحقیق سے شغف رکھتا ہو۔ اس موضوع سے علمی مناسبت رکھتا ہو تو اسے اپنا علمی معیار اس حد تک بلند کرنا چاہیئے کہ وہ بھی غور و فکر اور اجتہاد کی اس منزل تک پہنچ جائے (۱)

جب آدمی میں اجتہاد کی اہلیت و لیاقت اور اس کے لئے مطلوب شرائط مکمل طور پر پائی جاتی ہوں تو اس کو کسی کی پیروی اور تقلید کی بجائے خود اپنے اجتہاد و فکر کو رہنما بنانا چاہیئے۔ مسائل میں غور و فکر اور اجتہاد کے ذریعہ براہِ راست احکامِ شرعیہ معلوم کرنا چاہیئے لیکن اجتہاد اور بحث و تحقیق کا جو علمی و استدلالی طریقہ کار ہے اسکی رعایت اور پابندی ضروری ہے۔

فقہ کے چار مشہور مکاتبِ فکر میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا چاہیئے۔ احکامِ شرع پر عمل آوری میں اسی مسلک و مکتب فکر کے علماء و ائمہ کی آراء کو دلیل و رہنما بنانا چاہیئے۔ آدمی یہ کہے کہ میں ان مسالک کا پابند نہیں رہوں گا، بلکہ ان کی مخالفت کروں گا تو ایسا شخص یقیناً خطاکار ہے۔ کیوں کہ پوری شریعت کا کوئی بھی مسئلہ، ان چار مذاہب کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا (۲)

وہ مسلمان جو اجتہاد کی صلاحیت سے محروم ہو۔ اسے معتبر علماء کی مستند کتابوں سے استفادہ کرنا چاہیئے اور اس یقین کے ساتھ تمام شرعی احکام پر عمل کرنا چاہیئے کہ فقہ و شریعت کے تمام مسائل علماء و

---

(۱) الاصول العشرین / ۷۔

(۲) مختصر الفتاویٰ المصریہ لابن تیمیہ ص: ۵۴۔

فقہاء کی غیر معمولی تحقیق و جستجو کا حاصل اور خلاصہ ہے۔ ان کی تحقیق پر ہمیں ہر طرح کا اعتبار و اعتماد ہے۔ کسی غیر مجتہد کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ قرآن مجید کی کسی مطلق آیت یا کسی حدیث کا از خود معنی و مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے بلکہ اسے علماءِ راسخین کی آراء پر عمل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نصوصِ شرعیہ کے عموم و اطلاق کا حقیقی مفہوم وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو شریعت کے تمام اصول و اصطلاحات سے پوری واقفیت رکھتے ہوں (۱)

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کسی مخصوص مسئلہ میں مستند علماء کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُس مسئلہ میں فتویٰ ان کے اپنے فقہی مسلک پر نہیں بلکہ کسی دوسرے مسلک کے مطابق ہے تو اس صورت میں علماء کی رائے کو اپنے مسلک پر ترجیح دینا ضروری ہے۔

---

(۱) الدرة المضیة (تقی الدین السبکی) ص: ۲۰۔

عقیدہ کا مسئلہ

جس طرح اہلِ قبلہ کے نزاعی اور اختلافی مسائل میں کسی کی تکفیر جائز نہیں۔ اسی طرح کسی مسلمان کو اس سے صادر ہونے والے کسی جرم یا گناہ کی بنا پر کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ مسلمانوں کا خون، ان کے اموال و اسباب اور ان کی عزت و آبرو سب قابلِ احترام ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے:

فکل المسلم علی المسلم حرام دمہ وماله وعرضه، ومن صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا وأکل ذبیحتنا فهو المسلم له ذمة الله وذمة رسوله۔

ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر احترام لازم ہے اس کا مال، اس کی آبرو اور اس کا خون حرام ہے۔ جو شخص نماز پڑھے، مسلمانوں کے قبلہ کی طرف رُخ کرے، ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے، اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

جو شخص بھی اپنے کسی بھائی کو کافر قرار دے اور "اے کافر" کہہ کر پکارے تو دونوں میں سے کوئی نہ کوئی کافر ہوگا۔ اگر مخاطب کافر نہ ہو تو کہنے والا کافر ہوگا۔ سوائے اس کے کہ وہ کوئی ایسی مناسب تاویل کرے جس سے وہ اس حکمِ شرعی کی زد میں نہ آنے پائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاطب بن ابی بلتعہ کے لئے کہا تھا

اے اللہ کے رسول مجھے اجازت دیجئے میں اس منافق کی گردن اڑادوں حضورؐ نے فرمایا، غزوۂ بدر میں انہوں نے شرکت کی ہے، کیا تمہیں خبر ہے کہ اللہ اہلِ بدر سے خوب واقف ہے۔ اس نے پہلے ہی اہلِ بدر کو مغفرت کی بشارت دے دی ہے (۱)

اس لئے ہم کسی ایسے مسلمان کو ہرگز محض اپنی رائے یا اس کے ارتکابِ گناہ کی وجہ سے کافر نہیں، جو کلمۂ شہادت کا اقرار اور اسکے تقاضوں پر عمل کرتا ہو، اور فرائض ادا کرتا ہو، تکفیر اسی وقت جائز ہے جب اس کو کسی کلمۂ کفر کا اقرار ہو یا دین کی کسی مسلّم حقیقت اور بدیہی حکم کا منکر ہو۔ یا قرآنِ مجید کی صریح وغیر مبہم ہدایات کی تکذیب کرتا ہو یا اس کی ایسی تفسیر و توضیح کرتا ہو جو عربی زبان و ادب کے اسلوبِ بیان سے کسی طرح بھی ہم آہنگ نہ ہو۔ یا اس نے کوئی ایسا عمل کرلیا ہو جس کی "کفر" کے سوا کوئی اور تعبیر نہ کی جاسکتی ہو (۲)۔

چنانچہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

عقیدہ و اعتقاد کے باب میں اختلاف کرنے والا ہر شخص گمراہی کی ہلاکت ہی میں نہیں گر جاتا، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے اجتہادی خطا واقع ہوتی ہے، اور اس کی خطا عند اللہ معاف کردی جاتی ہے، کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے علم و تفقہ کے ذریعہ حجت کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوسکتے ہیں جن کی اتنی نیکیاں ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسنات سے سیئات کو ختم فرمادیں گے (۳)

---

(۱) بخاری (فتح ۶۲/۹) (۲) الاصل /۲۰۔

(۳) مجموعۃ الفتاویٰ ۱۷۹/۳۔

امام ابن تیمیہؒ اس پر مزید زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

جو لوگ میرے ساتھ رہتے اور اٹھتے بیٹھتے ہیں، وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں ہمیشہ لوگوں کو ٹوکتا اور منع کرتا رہتا ہوں کہ کسی بھی شخص متعین کے بارے میں تم کافر، فاسق اور گنہگار وغیرہ مت کہا کرو تا آں کہ اس پر حجت قائم نہ ہو جائے۔ اور میں صاف صاف یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ـــــ اس امت کی خطاؤں کو معاف فرما دیں گے، چاہے ان کا تعلق اعتقادی مسائل سے ہو یا عملی مسائل سے۔

اس طرح کے بہت سے مسائل میں اسلاف کے درمیان ہمیشہ اختلاف رہا لیکن ان میں سے کسی نے دوسرے کے خلاف کفر، فسق یا معصیت کا نعرہ بلند نہیں کیا (۱)۔

ہمارے ائمہ اور علماء پر اہم ترین ذمہ داری عائد ہوتی ہے موجودہ زمانہ میں جب کہ قرآن و حدیث اور فقہ پر گہری نظر رکھنے والے لوگ حدیث و سنت کے ذخیرہ میں صحیح اور ضعیف کے درمیان فرق و امتیاز کرنے والے اصحاب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں علماء و اہل علم پر عقائد کے تئیں احکام عوام سے مختلف ہوں گے، اسی طرح جو لوگ اسلامی ملکوں اور اسلامی ماحول میں رہتے ہوں، ان کے احکام ان لوگوں سے مختلف ہوں گے جو خالص غیر اسلامی ملک اور ماحول میں رہتے ہوں۔

---

(۱) مجموعۃ الفتاویٰ ۳/۲۲۹۔

مداہنت اور چشم پوشی

مداہنت اور چشم پوشی کو شریعت میں ناپسند سمجھا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس میں منکر و معصیت اور حرام و ناجائز کاموں سے محض اس لئے چشم پوشی برتی جاتی ہے کہ کہیں کسی منکر یا ناجائز کام کرنے والے کو اس کے عمل پر ٹوکا جائے تو وہ ناراض نہ ہو جائے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس کے باوجود برائی سے روکنا واجب ہے۔ روئے زمین پر کوئی برائی ہوتی، دیکھی جائے تو ہاتھ اور زبان سے ممکن حد تک اس کا دفع کرنا تو ضروری ہے ہی۔ لیکن حدیث نبوی میں نہی عن المنکر کا آخری اور کم از کم درجہ یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی، برائی اور برائی کرنے والے کو دل میں برا سمجھے، جس شخص میں نہی عن المنکر کا یہ آخری درجہ بھی نہ پایا جائے، اس میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا۔

البتہ کسی فاسق کو کھانا کھلانا، خود اس کی دعوت و ضیافت کو قبول کرنا اور اس کی خوشیوں میں شریک ہونا یا اس کی کسی خوبی اور نیکی کی وجہ سے اس سے اظہار محبت کرنا، مداہنت کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لاینہاکم اللہ عن الذین	اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک
لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم	اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم

من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم۔ (الممتحنہ : ۸)

سے دین کے بارہ میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد ثقیف میں شامل تمام افراد کو مسجد میں آنے کی اجازت دی جب کہ وہ سب کافر تھے تو فاسق بہرحال قرآن کی اس آیت کے مخاطبین میں ضرور شامل ہے جن کے بارے میں اس نے کہا:

ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن (العنکبوت : ۴۶)

اور تم اہل کتاب سے مباحثہ مت کرو بجز مہذب طریقہ کے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم۔ (الانعام : ۱۰۸)

اور انہیں دشنام نہ دو جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے رہتے ہیں ورنہ یہ لوگ اللہ کو حد سے گزر کر براہ جہل دشنام دیں گے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت چاہنے لگا، آپ نے کہا "بہت بُرا آدمی آپہنچا ہے" لیکن جب آپ نے اندر آنے کی اجازت دی اور وہ بیٹھ گیا، تو اس سے بڑی نرم گفتگو فرمائی۔ جب وہ شخص لوٹ گیا تو حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ پہلے آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا، پھر اس شخص کے بیٹھنے کے بعد آپؐ نے غیر معمولی خوش طبعی اور انس کا ثبوت دیا، حضورؐ نے فرمایا، اے عائشہ! کبھی تم نے مجھے فحش گو پایا ہے۔ یاد رکھو، قیامت کے دن مرتبہ کے اعتبار سے لوگوں میں بُرا آدمی وہ ہے جسے لوگ اس کے شر سے بچنے کی خاطر ترک کر دیں۔ (صحاح ستہ)

تاہم اہلِ کفر اور اہلِ فسق میں وہ لوگ جو کسی اعتبار سے اپنی جگہ عزت و وجاہت اور منصب و سیاست کے حامل ہیں، ان کا احترام

اور محبت و تعظیم محض اس خیال سے کہ شاید وہ خیر و صلاح کی طرف رجوع کریں اور راہِ راست کو اپنی رہ گذر بنائیں یا اس وجہ سے کہ ان کی وجہ سے حق اور اہل حق کے کام کو تقویت اور فروغ حاصل ہوتا ہے یا اس لئے کہ وہ خود باطل کے لئے ذلت و رسوائی کا ذریعہ ہیں یا کسی اور مصلحت کی بنا پر ایسے لوگوں کی تکریم کے جائز ہونے میں کوئی شبہ اور اشکال نہیں۔ اس طرح کا معاملہ تو خود حضورؐ نے بہت سے رؤساء اور سرداران مشرکین کے ساتھ فرمایا، کبھی تو آپؐ نے اس قدر چشم فراخی اور وسعتِ ظرفی کا ثبوت دیا کہ اپنی چادر مبارک ان لوگوں کے لئے بچھادی اور تا قیامِ قیامت مسلمانوں کو تعلیم دی کہ جب کسی قوم کا کوئی معزز فرد تمہارے پاس آئے تو تم اس کی عزت افزائی سے گریز نہ کرو (۱)

لیکن یہی محبت و تعظیم کسی ایسی مصلحت کی بنیاد پر ہو جو تقاضائے شریعت کے خلاف ہو، مثلاً کوئی مادی اور دنیوی منفعت کا حصول مقصود ہو یا کسی جانی و مالی نقصان کو دور کرنے میں اس سے مدد لینے کا خواہاں ہو تو اس سلسلہ میں زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ اس طرح کا عمل غیر مباح اور ناپسندیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد :

تلقون الیھم بالمودۃ۔ (الممتحنہ: ۱) کہ ان سے محبت کا اظہار کرنے لگو۔

کا خطاب ہر اس شخص سے ہے جو اسلام دشمنوں سے کسی منفعت اور مادی فائدہ کی امید رکھتے ہوئے مداہنت اور چشم پوشی اختیار کرے، قرآنی آیت کے اس ٹکڑے میں مودت اور دوستی کا جو لفظ آیا ہے وہ عام ہے، اس میں ہر قسم کی دوستی اور مودت شامل ہے، قرآن حکیم کی ان دو آیتوں پر غور کیجئے :

---

(۱) صحیح الجامع الصغیر: ۲۶۶۔

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا	اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں (اپنے حق
فتمسکم النار۔ (ھود : ۱۱۳)	میں) ورنہ تمہیں بھی (دوزخ کی) آگ چھو جائے گی۔
قل ان کان اٰباؤکم وابناؤکم	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے لڑکے
واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم	اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے
واموال اقترفتموھا وتجارۃ	کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت
تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا	جس کے بگڑ جانے سے تم ڈر رہے ہو اور وہ گھر
احب الیکم من اللہ ورسولہ و	جنہیں تم پسند کرتے ہو (یہ سب) تم کو اللہ اور اسکے
جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی	رسول سے اور اسکی راہ جہاد کرنے سے زیادہ عزیز
یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی	ہوں تو منتظر رہو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے
القوم الفاسقین۔ (توبہ : ۲۴)	اور اللہ نافرمان لوگوں کو مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

ان آیتوں میں رب تعالیٰ نے اس حقیقت پر متنبہ کیا ہے کہ ظالموں اور کافروں کا ساتھ نہ دینے اور ترکِ تعلق کرنے سے کسی نقصان کا خوف اور اندیشہ یا ان سے کسی منفعت کے حصول کی توقع اور امید، کوئی ایسی معقول وجہ نہیں ہے جس سے ان کے ساتھ ترکِ جہاد یا ان کی تعظیم و محبت کا جواز پیدا ہوتا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے :

ان الذین توفھم الملائکۃ	بیشک ان لوگوں کی جان جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر
ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم، قالوا	رکھا ہے (جب) فرشتہ قبض کرتے ہیں تو ان سے
کنا مستضعفین فی الارض، قالوا	کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے، وہ بولیں گے کہ ہم
الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا	اس ملک میں بے بس تھے، فرشتہ کہیں گے کہ
فیھا۔ (النساء : ۹۷)	اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟

علماء سلف کے بعض غیر مسلم حکمرانوں اور اہلِ کفر سے تعلقات کی

بابت جو روایتیں اور تاریخی ثبوت ملتے ہیں، ان کی حقیقت محض اس قدر ہے کہ وہ تعلقات و روابط کسی ضرورت کی تکمیل تک محدود ہوتے یا پھر قبل از وقت متعین اور طے شدہ دعوت پر وہ حاضر ہوتے لیکن شاہی دربار میں سلام و آداب، تسلیم و اطاعت، خود سپردگی، تہنیت و مبارکبادی، تملق و چاپلوسی، کسی سفر کے موقع پر رخصت و وداع کی محفل میں حاضری، سفر سے واپسی پر استقبال اور اس طرح کے کاموں سے وہ اپنا وقار متاثر نہیں کرتے عالمانہ وقار اور فاضلانہ کردار کی بہر طور حفاظت کرتے ——— تاہم وعظ و تذکیر، تبلیغ و دعوت، اصلاحِ حال اور تعمیرِ سیرت کے لئے ہمارے علماء کا سفر، معاشرہ کا امیر و غریب اور حاکم و محکوم سبھوں کے یہاں آمد و رفت کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں، بلکہ یہ "فرض شناسی" اور "نقشِ نبوی" کی پیروی ہے ——— خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ابوجہل کے مکان اس لئے تشریف لے گئے تاکہ اُسے اس کے اپنے قرضدار کے قرض کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائیں ——— اس طرح کے تمام کاموں میں اصل معیار آدمی کا قصد و ارادہ اور نیت ہے (۱)

ضرورت کے موقع پر انفرادی حیثیت سے کسی غیر مسلم یا فاسق و کافر سے مدد طلبی میں کوئی حرج نہیں۔ رسولِ اکرمؐ کا ایک موقع پر اپنے چچا ابو طالب سے حمایت و حفاظت کی درخواست کرنا اور اسی طرح مطعم بن عدی کی حفاظت و پناہ میں رہنا، خود حدیثوں سے ثابت ہے۔ اس طرح کے معمولی منافع اور فوائد کا حصول، شریعت میں منع نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) البحر الذخائر ۶/۵۰۵

ایمان کے لئے خطرہ

ایمان کی اصل بنیاد کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی ہے اور لوگوں کی اکثریت جس مرض کی شکار ہے وہ انسانی اور بشری قانون کو خدائی قانون پر بالادستی عطا کرنا اور اللہ کی شریعت کے مقابلہ میں "انسانی قانون سازی" کو اہمیت دینا ہے، جس کی اسلامی شریعت میں مذمت کی گئی ہے۔

"خدا کی نگاہ میں وہ لوگ مبغوض اور ناپسندیدہ ہیں جو احکامِ الٰہی سے سرتابی اور حکم عدولی کے مجرم ہیں، جو اللہ کی اس شریعت سے منھ پھیرتے ہیں جو محض خیر اور نیکی میں سبقت اور برائی اور بدی سے نفرت کی تلقین کرتی ہے، اللہ کی عادل و منصف شریعت سے ہٹ کر ہوا پرست انسانوں کی رائے اور قانون سازی پر یقین رکھتے ہیں، جیسا کہ عہد جاہلی کے لوگ مختلف گمراہ کن اور جہالت و ضلالت کے مرکب انسانی قوانین کی روشنی میں فیصلے کیا کرتے تھے، اسی طرح تاتاریوں کے یہاں "یاسق" کے نام سے ایک کتاب تھی جو مختلف مسائل و احکام کے مجموعہ کی حیثیت سے مشہور تھی، اس کتاب میں ذکر کردہ تمام مسائل و احکام، مختلف شریعتوں، یہودیت، نصرانیت اور شریعتِ اسلام سے لئے گئے تھے اور بہت سے احکام وہ تھے جو محض

ہوا پرستی اور دنیا طلبی کی بنیاد پر وضع کیے گئے تھے، چنانچہ وہی احکام اور قوانین لوگوں میں اصل حیثیت اختیار کر گئے، جس طرح آج اسلامی شریعت، لوگوں کی زندگیوں سے نکل کر صرف تحریروں اور کتابوں کی شکل میں باقی رہ گئی ہے، اسی طرح ان لوگوں نے بھی اپنی اپنی شریعتوں کے ساتھ "طرزِ تغافل" برتا، شرعی احکام کو انسانی عقل کی میزان میں رکھا اور عقل و خرد کی رہنمائی ہی کو "معیارِ حق" سمجھا، عقل و فہم کی باتوں کو اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کے مقابلہ میں صحیح اور درست سمجھا ——— ظاہر بات ہے ایسے لوگ شریعت کی نگاہ میں "کافر" قرار پائیں گے جن سے قتال اور جہاد واجب ہے تا آنکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی بالادستی تسلیم کریں اور شریعت کی طرف سچے جذبہ اور خالص یقین کے ساتھ رجوع ہوں۔

مذکورہ بالا عبارت میں شرک و کفر کی جس قسم کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کی درجہ بندی کی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ بڑا شرک ہے یا چھوٹا؟ بلکہ ہمیں اس صورتحال کو بدلنے کی ترجیحی بنیادوں پر فکر کرنی چاہیے، کیوں کہ طاعات و عبادات میں صرف خدا اور اس کے رسول کی بات ہی "قولِ حق" ہے شریعت کے اس اصول پر تو ہم زبان و دل کی رفاقت کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ ہر وہ کام جس میں اللہ کی نافرمانی ہو، اس میں مخلوق کی اطاعت اور پیروی جائز نہیں، انسان جو اللہ کی ایک مخلوق ہے، اس کی ناراضگی قابلِ برداشت ہے، کسی بھی انسانی حکم کی اطاعت اور پیروی کا مسلمان اس وقت تک مکلف ہے جب تک کہ اس میں اللہ کی نافرمانی شامل نہ ہو، اللہ کو چھوڑ کر کسی کی بھی اطاعت و محبت میں "معصیتِ خداوندی" کو راہ ملتی ہو، وہ سراسر ناجائز ہے، اس معاملہ

یں شریعت اس قدر حساس ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ کوئی مسلمان حاکمِ وقت، اگر معاذاللہ اسلام سے پھر جائے اور مرتد ہو جائے تو اس کے خلاف جہاد و قتال مسلمانوں پر واجب ہے ——— نیز اس موقع پر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ جس چیز کو شریعت نے حرام قرار دیا ہو جیسے زنا، شراب وغیرہ، ان کو حلال و جائز قرار دینا یا اللہ کی مقرر کردہ حدود کو کالعدم قرار دینا اور اللہ کی شریعت سے منھ پھیر کر اپنی طرف سے کوئی قانون سازی کرنا کفر ہے۔

اس طرح کے مواقع پر ان حدیثوں کے ظاہر سے استدلال کی کوئی گنجائش نہیں ہے جن میں طاعت و عبادت، اجتماعیت، غلطی کی اصلاح میں صبر و برداشت اور ظالم کو ظلم سے روکنے اور ظلم کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اور اس طرح کی حدیثوں سے وہ لوگ خوب استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے لئے اللہ کی "عادلانہ شریعت" اور "انسانیت کے خیر خواہ دین" کے قیام کے لئے مجاہدہ کو شش کرنا گراں خاطر ہوتا ہے اور ظالم حکمرانوں اور خدا کی شریعت کے باغی اہلِ سلطنت اور اصحابِ اقتدار کی طاعت و عبادت اور خوشنودی ان کے لئے آسان اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طاعت و محبت کی فضیلت حدیثوں میں آئی ہے، اجتماعیت و وحدت تو اسلام کا نعرۂ اولیں ہے، دعوت و اصلاح میں قوتِ برداشت ایک اہم عنصر ہے، ظلم سے روکنا، ایمانی و اخلاقی فریضہ ہے لیکن ہر ایک کا ایک موقع و محل ہے، ان سب باتوں میں "خالق کی نافرمانی"، چونکہ انتہائی نفرت انگیز اور گھناؤنا جرم ہے اس لئے اسے برداشت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے ——— آج تمام اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے یہاں "اجتماعیت" کا نشان اور لیبل ضرور ہے، اجتماعیت و ہم آہنگی کا نعرہ ہر ایک لگاتا ہے لیکن اللہ کی شریعت کا مکمل طور

پر نفاذ نہیں ہے، در پردہ کتنی ہی برائیاں جنم لیتی ہیں لیکن ان کی زبان "اجتماعیت" ہی کے ورد سے تر ہے، اس لئے ہر طرح کی حدیثوں بلکہ اسلامی اصولوں کی بیک نظر، رعایت ضروری ہے۔

قرآن مجید کی یہ دو آیتیں پڑھئے:

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا۔ (القصص: ۵۷)	اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر ہدایت پر چلنے لگیں تو فی الفور اپنے مقام سے مار کر نکال دیئے جائیں۔
فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ط (المائدۃ: ۵۲)	اسی لئے تم ایسے لوگوں کو جن کے دل میں مرض ہے دیکھتے ہو کہ دوڑ دوڑ کر ان میں گھستے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو اندیشہ ہے کہ ہم پر کوئی حادثہ پڑ جائے

معلوم ہوا کہ اللہ کی سب سے بڑی نافرمانی، خواہ کسی عذر کے تحت ہو، اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کی خلاف ورزی ہے۔

شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض وہ صورتیں بیان کی ہیں جو ایک حاکمِ وقت کو بھی کفر میں داخل کرتی اور ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دیتی ہیں:

"کسی دلیل شرعی کے بغیر کوئی حاکم اللہ کی شریعت کے احکام کی بہتری اور اس کے ذریعہ خیر و فلاح ہونے کو تسلیم نہ کرے تو اہلِ علم کے درمیان یہ متفقہ اصول ہے کہ دین کی کسی اصل یا کسی متفق علیہ فرع کا انکار کرنے والا کافر ہے، ——— یا کسی حاکم کا اعتقاد یہ ہو کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مقابلہ میں فلاں کے احکام زیادہ بہتر ہیں، زیادہ مکمل ہیں، انسانی ضروریات اور تقاضوں

کے مطابق ہیں ـــــــ ظاہر ہے ایسے شخص (حاکم) کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ایک حکیم وخبیر خدا اور رسول کے احکام کے مقابلہ میں مخلوقِ الٰہی کے احکام، جو انسان کی ناقص عقل و فہم اور ناپختہ فکر کا نتیجہ ہے، کو زیادہ بہتر یقین کیا ـــــــ یا کسی حاکم نے اپنے بارے میں یہ خیال کیا کہ وہ خدا کا ہم مثل ہے، یا وہ کسی معاملہ میں خلافِ شریعت فیصلہ کرنے کو جائز سمجھتا ہو، اس کا حکم بھی وہی ہے کہ وہ مخلوق و خالق کو برابری کا درجہ دیتا ہے۔" (۱)

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"اللہ کی شریعت سے ہٹ کر کسی اور بنیاد پر فیصلہ کرنے میں صحیح یہ ہے کہ کفر کی دو صورتیں پائی جاتی ہیں، حاکم کی خلاف ورزی کے مطابق کبھی وہ کفرِ اصغر قرار پاتا ہے اور کبھی کفرِ اکبر، اگر پیش آمدہ صورت میں حاکم اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ کو ضروری تو سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود عدول حکمی کرتا ہے اور اللہ کے یہاں سزا کا مستحق ہونے کا اعتراف بھی ہے تو یہ کفرِ اصغر ہے۔ اور اگر اس کے برخلاف شریعت کے مطابق فیصلہ کو ضروری نہیں سمجھتا اور فیصلہ کے لئے وہ مکمل بااختیار ہے، نیز پیش آمدہ مسئلہ میں حکم الٰہی کے بابت مکمل یقین رکھنے کے باوجود اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو یہ کفرِ اکبر ہے، اور اگر اس اصول سے وہ ناواقف ہو کر اس نے غلطی کی ہے تو وہ "مخطیئن" (غلط کاروں) کے حکم میں ہے" (۲)

---

(۱) تحکیم القوانین ص: ۵ (ملخصاً)

(۲) مدارج السالکین ۱/۳۳۷۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے ایک جگہ لکھا ہے:

"دین کی یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر وہ جماعت جو اسلام کے ظاہر اور متواتر احکام سے منھ پھیرے مثلاً نماز کا ترک کرنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، ایسی بدعات کا علی الاعلان اختیار کرنا کہ عقیدہ و عبادت کے باب میں وہ اسلام کے مخالف ہوں، اور اس طرح کے دیگر مسائل میں حکمِ الٰہی کی نافرمانی کرے تو ان سے جہاد و قتال تمام ائمہ کے یہاں واجب ہے اگرچہ کہ وہ کلمۂ شہادت کا زبان سے اقرار کرتے ہوں، ان سے اسی طرح قتال و جہاد واجب ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہؓ نے فتنۂ ارتداد اور فتنۂ خوارج کے مواقع پر جہاد فرمایا تھا ——— یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر دین میں داخل ہو جائیں ——— خلاصہ یہ کہ شریعتِ اسلامیہ کے کسی ایک حکم کو نہ ماننے والے سے جہاد و قتال کے وجوب پر ائمہ کا اتفاق ہے تو شریعت کے تمام احکام یا اکثر احکام کو نہ ماننے والے سے جہاد و قتال بدرجۂ اولیٰ واجب ہے" (۱)

---

(۱) مختصر الفتاویٰ المصریہ لابن تیمیہؒ ص: ۴۹۸۔

اتباعِ حق کی اہمیت

قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیراً۔ (النساء : ۱۱۵)

اور جو کوئی بعد اس کے کہ اس پر (راہ) ہدایت کھل چکی، رسول کی مخالفت کرے گا اور مؤمنین کے راستہ کے علاوہ (کسی راستے) کی پیروی کرے گا ہم اسے کرنے دیں گے، جو کچھ وہ کرتا ہے اور پھر اسے ہم جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

❊ ❊ ❊

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے :

من خالف جماعة المسلمین شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه حتی یراجع۔ (۱)

جس شخص نے مسلمانوں کی جماعت اور اجتماعیت کی ذرہ برابر بھی مخالفت کی، اس نے اپنی گردن سے اسلام کا بندھن نکال پھینکا تا آنکہ وہ رجعت نہ کرلے۔

آپؐ نے فرمایا :

وعلیکم بالسواد الاعظم

وحدت و اجتماعیت تم پر لازم ہے، جو

(۱) مسند احمد، ابوداؤد (صحیح الجامع الصغیر ۶۲۸۶)

ومن شذ شذ فی النار۔ (۱)

جو شخص بھی اجتماعیت سے کنارہ کش ہوا وہ جنت کی اجتماعیت سے نکال کر جہنم میں ڈال دیا گیا۔

⁂ ⁂ ⁂

قرآنِ مجید اور حدیث نبوی کی یہ کچھ عبرت آموز اور فکر انگیز نصیحتیں ہیں جو ہمیں دین میں بدعت پیدا کرنے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی خلاف ورزی کرنے سے روکتی ہیں۔ اہلِ بدعت، ہوا پرست، خواہشِ نفس کے بندوں اور گم گشتہ راہ انسانوں کی پیروی و اتباع سے بچنے کی تلقین کرتی ہیں، وہ گمراہ جن کے عقیدہ و عمل میں اختلاف نے انہیں اسلام سے ہٹا کر مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا۔

کل حزبٍ بما لدیھم فرحون۔ (المؤمنون: ۵۳)

ہر گروہ کے پاس جو (دین) ہے وہ اسی میں مگن ہے۔

ان ہی لوگوں نے دین میں بدعت و ہوا پرستی کی تخم ریزی کی، بدعت کے پرچم لہرائے اور شرور و فتن کا ایک ناپیدا کنار سلسلہ شروع کر دیا، اب نتیجہ یہ ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی تعلیمات سے اختلاف ہی نہیں رکھتے ہیں بلکہ در حقیقت اس کی مخالفت کرنے لگے ہیں اور اس کتاب سے اپنا رشتہ ختم کرنے پر آمادہ ہیں، خدا پر جھوٹ گھڑتے ہیں اور بلا علم و تحقیق کتابِ الٰہی کے بارے میں کلام کرتے ہیں، اُن کی گفتگو، دجل و فریب کا کچھ ایسا معمہ ہوتی ہے کہ عام لوگ بہت جلد اور بڑی آسانی کے ساتھ ان کے دامِ فریب میں پھنس جاتے ہیں، پس جس شخص نے بھی ان کی توقیر کی اور ان کی باتوں کی تصدیق کی، اس نے اسلام کی عمارت کے انہدام میں حصہ لیا، گناہ اور سرکشی کی راہ میں تعاونِ

(۱) ترمذی (تحفہ ۶/۳۸۶)

عمل پیش کیا، حدیث میں فرمایا گیا :

ستۃ لعنھم اللہ وکل نبی مجاب الزائد فی کتاب اللہ، والمکذب بقدر اللہ، والمستحل حرمۃ اللہ، والمستحل من عترتی ما حرم اللہ، والتارك للسنۃ۔ (۱)

چھ آدمی ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اور ہر نبی مستجاب لعنت بھیجتے ہیں، کتابِ الٰہی میں زیادتی کرنے والا، اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا، حرام کو حلال جاننے والا، اہلِ بیت کی بے حرمتی کرنے والا اور سنت کا ترک کرنے والا۔

اس حدیث کے مصداق یقینی طور پر روافض اور معتزلہ ہیں جو اپنی کذب بیانی اور جہالت میں معروف ہیں، ان ہی لوگوں کے بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

لم ار اشھد للزور من الرافضۃ۔

روافض سے زیادہ جھوٹے گواہ میں نے نہیں دیکھے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کا مذہب اور ایمان تقیہ (کذب بیانی) اور نفاق ہے معتزلہ کی کتابوں پر اُن کا اعتماد ہے۔ تقدیر کو وہ ایک بے حقیقت شئ سمجھتے ہیں، صفاتِ باری کا انکار کرتے ہیں۔ قرآنی آیات کی وہ تفسیر اور تاویل کرتے ہیں جو عربی زبان، اس کے اسلوب بیان، قواعد و اصول اور اس کے مزاج و مذاق سے کسی طور اتفاق نہیں رکھتی، وہ قرآنِ مجید میں نقص و تحریف کا اعتقاد رکھتے ہیں، من گھڑت اور موضوع تصورات پر اُن کے عقیدہ کی بنیاد ہے۔ مشرکانہ اعمال میں ملوث ہیں، قبروں کا طواف، مردوں کی تعظیم، عصمت بشر کا اعتقاد اور بنی آدم کے لئے علمِ غیب کا اثبات وغیرہ۔ اپنے زعم کے مطابق اُن کے دینی افکار ہیں، آخرت میں خدا کے دیدار کی وہ نفی کرتے ہیں۔ چار صحابہؓ کے

---

(۱) طبرانی۔

سوا تمام اصحاب رسول اللہ کو وہ کافر سمجھتے ہیں۔ تمام صحابہ پر دشنام طرازی، فحش گوئی ان کی تکفیر اور خاص طور پر خلفاء ثلاثہ کی تکفیر کو وہ واجب سمجھتے ہیں۔ ام المومنین سیدنا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں طعن و تشنیع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسر پیکار ہونے والوں کی تکفیر، جیسے حضرت زبیرؓ اور اور حضرت طلحہؓ جن کے بارے میں جنت کی بشارت دی گئی ہے، ان کا عقیدہ ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ائمہ معصوم ہیں، علم غیب رکھتے ہیں، ان کے تمام ائمہ کی ہر بات قانونی اور تشریعی حیثیت رکھتی ہے کائنات کی تدبیر اور نگہبانی میں ان کا حصہ ہے خلافت کا انحصار ان ہی پر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے ائمہ کے سوا تمام مسلمان جہنم میں ڈالے جائیں گے، مرنے کے بعد وہ اپنے ائمہ کی دوبارہ واپسی کے قائل ہیں، ان کے یہاں القاب آداب کی کثرت ہے۔

فقہی مسائل میں بھی وہ افراط و تفریط کے شکار ہیں، کلمات اذان میں ان کے یہاں اضافہ ہے۔ نمازوں کے اوقات اور ان کی کیفیات، روزہ و افطار کے اوقات، حج و زیارت کے اعمال، بعض امور زکوٰۃ اور انکے مصارف اور میراث وغیرہ مسائل میں وہ سنت کی مخالفت کرتے ہیں۔ بغیر کسی عذر شرعی اور مجبوری کے وہ اکثر جمع بین الصلاتین کرتے ہیں۔ متعہ کے نام پر وہ زناکاری کو جائز سمجھتے ہیں۔ ولی اور گواہان کے بغیر نکاح، اپنی بیوی اور اس کی خالہ یا پھوپی کو ایک ساتھ زوجیت میں رکھنے، غیر فطری راہ سے جنسی خواہش کی تکمیل، پیروں کا مسح وغیرہ بہت سی چیزوں کو وہ مباح تصور کرتے ہیں، جمعہ اور جماعت کا ترک کرنا اور غیر شرعی رسوم اور تہوار منانا انکا شعار ہے، طعن و تشنیع اور کذب و افترا سے بھری کتابیں تالیف کرتے ہیں اور ان کتابوں کو مسلمان علماء اور ائمہ کی طرف بے بنیاد طور پر منسوب کرتے ہیں۔

امام ابوزرعہ رازیؒ فرماتے ہیں :

"جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ کسی صحابی کی عظمتِ شان میں گستاخی اور بدتمیزی کر رہا ہے تو سمجھو کہ وہ زندیق ہے اس لئے کہ ہمارے رسُول برحق ہیں، قرآن برحق ہے، یہ قرآنِ مجید اور حدیث وسنت کے یہ مجموعے ہم تک ان ہی صحابہؓ کرام نے تو پہنچایا، لیکن یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے گواہوں کی شخصیت کو مجروح اور داغدار کر دیں تاکہ قرآن و حدیث کا صحیح استناد، اس کی شناخت اور تشخص ختم ہو جائے۔ اَب ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم ان کی اس منافقانہ حرکت کو واشگاف کریں۔ اس لئے کہ حقیقت میں یہ زندیق اور اسلام کے بدخواہ ہیں۔"

عمل صالح کی ترغیب

علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب مختصر الفتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"کبھی کبھی نفل نماز کے لئے لوگوں کا جمع ہونا اور باجماعت ادا کرنا مستحب ہے، جب تک کہ اس میں کسی مادی منفعت کا دخل نہ ہو، اسی طرح کسی اور مصلحت کی وجہ سے بھی باجماعت نماز کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، مثلاً خشوع وخضوع اور آداب کی رعایت کے ساتھ تنہا نماز نہ پڑھ سکتا ہو یا تنہا نماز پڑھنے میں نشاط محسوس نہ کرتا ہو، ایسی صورت میں جماعت افضل ہے۔ اس نوعیت کی جماعت کا گھر میں اہتمام کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تاہم کسی زیادہ اہم مصلحت کی بنا پر مسجد میں بھی پڑھی جاسکتی ہے ——— لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ جس جماعت کی پابندی شریعت میں مطلوب نہیں، اس جماعت کی پابندی اور اس پر مداومت مکروہ ہے[عہ] (۱)۔"

یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا کسی امیر، کسی حاکم اور والیِ سلطنت کیلئے یہ بات جائز ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں، پیروکاروں اور رعایا

---

(۱) ص ۴۷۔

عہ حنفیہ کے یہاں نمازِ تراویح کے علاوہ کسی بھی نفل نماز میں "تداعی" کے ساتھ جماعت مکروہ ہے۔ "تداعی" کی تعریف فقہاء متأخرین نے یہ کی ہے کہ تین سے زیادہ نمازی ہوجائیں، گویا تین یا اس سے کم شرکاءِ نماز ہوں تو حنفیہ کے یہاں بھی جماعت کی گنجائش ہے۔ (مترجم)

پر کسی ایسی عبادت کی انجام دہی لازم قرار دے، جسے شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا ہو، جیسے نمازِ تہجد، نمازِ تراویح، قرآن مجید کی ایک متعین مقدار کی تلاوت یا صدقہ خیرات وغیرہ۔

صحیح بات تو یہی ہے کہ اس کا اختیار بندوں کو حاصل نہیں، مستحب عبادات کی انجام دہی کو واجب اور ضروری قرار نہیں دیا جاسکتا، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اور طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ جس عبادت کی ترغیب دینا چاہتے اس عبادت پر حاصل ہونے والے اجر و ثواب کا تذکرہ فرماتے اور ترغیب کا یہ سلسلہ برابر جاری رکھتے، یہاں تک کہ لوگوں میں اس عبادت کا شوق پیدا ہو جاتا پھر وہ پختہ عزم اور ولولہ کے ساتھ اس عبادت کو انجام دیتے۔

تاہم تعلیمی اور تربیتی نقطۂ نظر سے عمل کی ترغیب اور عبادت کیلئے آمادہ کرنے کی غرض سے امیر اگر تھوڑی سی سختی برتے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ صحیح طریق کار ہے لیکن ترغیب میں کسی طرح وجوب ایجاب اور لزوم کا پہلو شامل نہ ہونا چاہیئے۔ سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور حاکم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس شخص پر ابرِ رحمت نازل فرمائے جو رات کے ایک پہر میں بیدار ہو اور نیازمندانہ خدا کے حضور عبادت کرے اور نماز پڑھے، پھر اپنی بیوی کو بھی بیدار کرے اور وہ بھی نماز پڑھے اگر بیوی نے اٹھنے میں سستی کی تو چہرہ پر پانی کا چھڑکاؤ کرے اور کسی طرح بیدار کرنے کی کوشش کرے ——— اللہ تعالیٰ اس عورت پر بھی رحمت نازل فرمائے جو رات کے ایک حصہ میں اپنے پہلوؤں کو خوابگاہ سے الگ کرلے، خدا کے حضور عبدیت و

بندگی اور اطاعت و محبت کا اقرار کرے اور نماز پڑھے، اپنے شوہر کو بھی بیدار کرے اور وہ بھی اٹھ کر نماز پڑھے۔ اگر شوہر نے اٹھنے میں کسی طرح کی غفلت اور سستی کی تو چہرہ پر پانی کا چھڑکاؤ کرے"۔ ——— اسی مضمون کی ایک روایت ابن ماجہ میں بھی مذکور ہے۔

امام مالکؒ نے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ رات کے ایک حصہ میں نمازیں پڑھتے اور عبادت کرتے، یہاں تک کہ جب رات کا آخری حصہ ہوتا تو اپنے اہل و عیال کو نماز کیلئے بیدار فرماتے اور کہتے نماز، نماز، پھر قرآنِ پاک کی یہ آیت تلاوت فرماتے :-

وأمُرْ أهلكَ بالصَّلوٰة	اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیتے رہیے
وَاصطبِرْ عليها لا نسئلكَ رزقاً	اور خود بھی اس کے پابند رہیے، ہم آپ سے
نحن نرزقكَ والعاقبة للتقوىٰ۔	معاش نہیں چاہتے، معاش تو ہم خود آپ کو
(طٰہٰ : ۱۳۲)	دیں گے اور بہتر انجام پرہیزگاری ہی کا ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گھبراہٹ کی حالت میں بیدار ہوئے اور فرمانے لگے :

سُبحان اللہ ——— ! رات اپنے پہلو میں کس قدر رحمت و برکت کے خزانے رکھتی ہے اور رات اپنے اندر کس قدر شرور و فتن کے سامان و اسباب رکھتی ہے ؟ (یعنی رات کی تاریکی میں رحمتِ الٰہی کے طلبگاروں کے لئے بے شمار خزانے کھلے ہیں۔ اور یہی رات ان لوگوں کے لئے شرور و فتن کا ذریعہ ہے جو دنیا کے اس خوبصورت مصنوعی چہرہ کو دیکھ کر غرور اور

دھوکہ کا سودا کر رہے ہیں) ازواجِ مطہرات کو کون بیدار کرے گا؟ تاکہ وہ نماز پڑھ سکیں۔

آہ ——————! اس فانی دنیا میں بہت سی زرق برق لباس و پوشاک میں ملبوس عورتیں، یوم آخرت میں بے لباس و بے ستر ہوں گی (۱)

خلاصہ یہ کہ مزنی اور استاذ کا اپنے شاگردوں اور امیر و حاکم کا اپنے پیروکاروں پر کسی عبادت کا بطورِ سزا لازم قرار دینا از روئے شرع صحیح نہیں ہے۔

---

(۱) بخاری۔

بیعت کی حقیقت

علماء، صلحاء اور بزرگوں کی صحبت و اطاعت، علم نبوت کے حصول اور اس سے اکتساب فیض کے لئے تقویت کا باعث ہوتی ہے اور یہ خاص طور پر ان مبتدی لوگوں کے لئے نہایت ضروری ہے جو علوم شرعیہ کے حصول اور دعوتِ دین اور اس کے پیغام کے سمجھنے میں اپنے آپ پر اعتماد نہیں رکھتے، بزرگوں اور اہلِ علم کی بافیض صحبت، فہم دین میں کسی طرح کی چوک، عمل و کردار کی راہ میں کسی قسم کی لغزش یا دین کے بنیادی تصورات میں مغالطہ سے محفوظ رکھتی ہے، ایسے ہی صلحاء سے انسانی زندگی کو صحیح سمت رہنمائی ملتی ہے اور بہت سے نفسانی امراض سے نجات حاصل ہوتی ہے، دعوت الی اللہ اور اسلام کیلئے کئے جانے والے ہر عمل کے کچھ حقوق و واجبات ہیں، کچھ بنیادی شرائط ہیں انہیں امور پر عہد و پیمان لیا جاتا ہے اور بیعت کی جاتی ہے۔ چنانچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المؤمنون عند شروطهم الاشرطاً احل حراماً او حرم حلالاً۔ (البخاری)

مؤمن اپنے عہد و پیمان کا پابند ہوتا ہے، سوائے ان شرائط کے جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتی ہوں۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

حاکم وقت، قاضی، مشائخ اور علماء وغیرہ اصحابِ مرتبت کی اللہ اور

رسول کے احکام میں اطاعت واجب ہے (۱) پس لوگوں کے درمیان ہونے والے تمام عقود و معاملات اور شرائط میں اصل معیار قرآن و حدیث ہے، ہر وہ شرط جو کتاب و سنت کے موافق ہو اس کا ایفاء ضروری ہے لیکن اگر کسی نے ایسی شرط رکھی جو اللہ کی شریعت سے متصادم ہو تو وہ باطل ہے اگرچہ کہ وہ اس طرح کی سو شرطیں لگا رکھے، کیوں کہ اللہ کی کتاب زیادہ صحیح ہے اور اس کے معاملات و شرائط زیادہ مضبوط اور مستحکم ہیں (۲)

بیعت نام ہے اس معاہدہ کا جس میں انسان امام المسلمین سے اپنی اطاعت و خود سپردگی اور وفاشعاری کا اقرار کرتا ہے۔ بیعت کی اس بنیاد کو سمجھنے میں ہمارے بعض صوفیاء نے غلطی کی اور وہ بیعت امام اور بیعت شیخ کو ایک ہی چیز سمجھ بیٹھے حالانکہ یہ ایک سنگین غلطی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی بیعتوں کا ثبوت ملتا ہے، کبھی لوگ آنحضورؐ کے ہاتھوں ہجرت و جہاد پر بیعت کرتے تھے، کبھی ارکانِ اسلام کے عملی نفاذ پر، کبھی کفار و مشرکین کے خلاف جنگوں میں ثبات و استقلال پر، کبھی فواحش و منکرات کے ترک پر اور کبھی بدعت سے اجتناب اور تنفر، سنت سے عشق اور طاعات کے شوق پر، اسی طرح حضرات انصار کی خواتین سے آپؐ نے معاہدہ اور بیعت لی کہ وہ خیانت کو راہ نہیں دیں گی۔

فقراء مہاجرین کی ایک جماعت سے آپؐ نے یہ بیعت لی کہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کریں گے، چنانچہ ان صحابہ میں بیعت کا اس قدر احترام تھا کہ کوڑا زمین پر گر جائے تو وہ بذاتِ خود گھوڑے سے اترتے اور اپنا کوڑا

---

(۱) قاعدة فی العقود ص: ۱۶۔

(۲) مجموع الفتاویٰ ۳۵/۹۷ - البخاری

اٹھاتے تاکہ بیعت کی خلاف ورزی اور عہد شکنی نہ ہونے پائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی عمل بطور عبادت ثابت ہو چکا ہو تو وہ یقیناً دین کی ایک سنت اور طریقہ بن جاتا ہے اب اس میں امتیازی فرق یہ ہوتا ہے کہ جو عمل آنحضورؐ نے بحیثیت خلیفہ کیا وہ خلفاً کے لئے سنت ہے، جو عمل آپؐ نے کتاب و حکمت کے معلم اور امت کے لئے مزکی (تزکیۂ نفس) کی حیثیت سے انجام دیا وہ علماء و صلحاء اور اہلِ تقویٰ کیلئے سنت ہے۔ خلفاء راشدینؓ کے زمانہ میں چوں کہ اسلام تمام مذاہب پر غالب آچکا تھا اس لئے اس وقت بیعتِ اسلام تو عملاً متروک ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود بیعتِ تقویٰ برابر ہوتی رہی۔ اس زمانہ میں بہت سے صحابہ جن کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تعلیم و تربیت ہوئی، انہیں خلفاء سے بیعت ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن جب آہستہ آہستہ صحابہ کا دور ختم ہوتا گیا تو علماء و مشائخ نے بیعت کی سنت کو زندہ اور جاری کیا (۱)۔

---

(۱) فتح البیان (نواب صدیق حسن خاں) ۹/ ۴۰ — ۴۳۔

عہد کی اہمیت

گذشتہ مضمون میں "رضا کارانہ بیعت" کے نام سے جس معاہدہ اور بیعت کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی شرعی حیثیت سنت کی ہے نہ کہ واجب کی، کیونکہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت کی اور قربِ الٰہی کے اعزاز سے سرفراز ہوئے لیکن اس بیعت سے پیچھے رہ جانے والوں کے گنہگار ہونے اور قصوروار ٹھیرنے کے سلسلہ میں کوئی ثبوت و دلیل نہیں ملتی اور نہ کسی امام نے اس پر نکیر فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ "بیعت" سنت کا درجہ رکھتی تھی وجوب کا نہیں۔

لیکن فتنہ و فساد کے ایسے پُرآشوب و پُرخطر زمانہ میں جب کہ دین و اسلام کی مضبوط رسی کے تانے بانے کمزور ہو رہے ہوں اور دین و شریعت کا پاس و لحاظ اور اس کی اہمیت رفتہ رفتہ کم اور ختم ہوتی جا رہی ہو، نظامِ خلافت کا تصور، زمانہ کی نئی اصطلاحات و ایجادات کے اثر سے مرعوب اور مضمحل ہو رہا ہو اور عقیدہ و عبادات اور بالخصوص نماز کے سلسلہ میں سستی و تغافل کا رجحان فروغ پا رہا ہو، ایسے ماحول اور زمانہ میں اجتماعی عمل پر اجر و ثواب کی حرص و طمع اور اپنی مکمل رضا و خوشی کے ساتھ کوئی شخص اپنی ذات پر بیعت کو لازم اور ضروری تصور کرے تو یہ بات جائز بلکہ واجب ہو جاتی ہے بلکہ اس طرح کے ماحول میں ہر مسلمان پر یہ بات ضروری ہے کہ وہ معاشرہ

کی اصلاح، انسان اور انسانیت کی فلاح یابی، تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کے مقصد سے اس "سنت بیعت" کو پھر از سر نو زندہ کرے اور اس مقصد کے حصول کے لئے انتھک کوشش اور سعی و کاوش صرف کرے، لوگوں کو ترغیب دے اور اس سلسلہ میں ان کے ذہن و دماغ کی گرہوں کو کھول کر انہیں اس طرف متوجہ کرے کہ کسی واجب کی تکمیل کی راہ میں مطلوبہ کوشش صرف کرنا بھی ضروری ہے۔

حالات اور تقاضائے زمانہ کے تحت ہر بیعت و معاہدہ کے کچھ اصول و آداب اور کچھ شرائط و قیود ہوتے ہیں، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ "بیعتِ رضوان" کے موقع پر حالات، زندگی اور موت کے اس دوراہے پر تھے جو مستقبل کے لئے کسی فیصلہ کن اقدام کے متقاضی تھے، چنانچہ صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر خدا کے دین کی سرفرازی اور اللہ کے کلمہ کی بلندی کے لئے جان نثاری اور فداکاری کی بیعت کی۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے لئے کوئی بھی کوشش اور دین کے بقاء و تحفظ کے لئے کوئی بھی عمل اہلِ دین و اصحاب ایمان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فہمِ دین، اخلاص عمل، حسنِ نیت، قربانی و جانبازی، طاعت و حسنِ سلوک، ثبات قدمی و استقامت، یکسوئی، اخوت و بھائی چارگی اور باہمی اعتماد جیسے بنیادی اوصاف اور داعیانہ کردار کیلئے بیعت و معاہدہ کریں۔ اس بیعت کے نتیجہ میں بہت سے فرائض و واجبات انسان کے ذمہ عائد ہوتے ہیں ـــــ تاہم بیعت و ارادت کا تعلق قائم کرنے سے پہلے اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ آپ جس شخصیت کے ہاتھوں پر بیعت ہو رہے ہیں اس کے با اعتماد و مستند ہونے پر آپ کو یقین حاصل ہو۔ اگر اس میں شرائط بیعت مکمل طور پر پائی

جاتی ہوں تو بیعت بھی صحیح ہے اور اگر مطلوبہ شرائط کی تکمیل میں آپ اسے ناقص تصور کرتے ہوں تو پھر ایسے شخص سے دامن بچانا ہی دینی تقاضا ہے۔ بہت سی باتیں قابلِ قبول ہوتی ہیں۔ اور بہت سی باتیں لائقِ رد ہوتی ہیں، اس قسم کی باتوں کو صحیح طور پر پرکھنے اور جانچنے کا معیار اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور پیغمبر اسلام کی "کتابِ حیات" (حدیث نبوی) ہیں، جو بات قرآن و حدیث کے مضمون و معنیٰ سے ہم آہنگ ہو وہ درست ہے اور جو بات قرآن و حدیث کی میزان میں قابلِ رد قرار پائے وہ سراسر خطا و جہل کا نتیجہ ہے۔

وعدہ کے سلسلہ میں قرآنی تعلیم یہ ہے کہ وعدہ اور معاہدہ کی تکمیل بہرصورت ضروری ہے۔

واوفوا بعهد الله اذا عاهدتم ولا تنقضوا الايمان بعد توكيدها وقد جعلتم الله عليكم كفيلاً۔ (النحل: ۹۱)	اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جب کہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو، اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔

ہر قسم کی بیعت و معاہدہ کی خلاف ورزی کی قرآنِ حکیم میں مذمت کی گئی ہے۔ بیعت و معاہدہ میں خواہ قسم و تاکید کے الفاظ موجود ہوں یا نہ ہوں، وعدہ کا ایفاء اور عہد و پیمان کے اصول کی پاسداری شرعی و اخلاقی تقاضا ہے۔ اور جس آدمی نے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے مقصد سے کسی بات کی نذر مانی تو اس نذر کو پورا کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ نذر اور عہد کی خلاف ورزی منافقانہ حرکت قرار پاتی ہے۔ منافق کی ایک علامت حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب وہ کوئی وعدہ کرتا ہے تو اس میں

خیانت اور عہد شکنی کرتا ہے، قیامت کے دن ہر خائن و دھوکہ باز کیلئے ایک پرچم نصب کیا جائے گا، اس قسم کے گناہوں میں آدمی کو چاہیئے کہ وہ نیکیوں کے ذریعہ قرب الٰہی حاصل کرے اور طاعات کے ذریعہ سیئات کے دروازوں کو بند کردے (۱)۔

آنحضورؐ کا ارشاد ہے:

"تم میں سے جو شخص جنت کے وسط (درمیانی حصّہ) میں داخل ہونا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ جماعت اور اجتماعیت کو لازم اور ضروری سمجھے، اس لئے کہ آدمی تنہا ہو تو اس کے ساتھ شیطان شریک ہو جاتا ہے اور جماعت و اجتماعیت سے شیطان گھبراتا اور دور ہو جاتا ہے" (رواہ احمد)

پھر اگر تم اجتماعیت پیدا نہ کرسکو تو کم سے کم امت کے اختلاف و انتشار کا باعث بھی نہ بنو کہ اگر تم امت کو جماعت کے سانچہ میں نہ ڈھال سکے لیکن وہ انتشار سے محفوظ رہے تو ممکن ہے کوئی اور شخص اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔

وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔ (محمّد: ۳۸)	اور اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

---

(۱) قاعدۃ فی العقود (ابن تیمیہؒ) ص: ۶۵۔

رفیقِ دشت و میرِ کارواں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ ہر جماعت، ہر قبیلہ اور افراد کے ہر مجموعہ پر ایک سربراہ اور نقیب متعین فرماتے جو اپنی جماعت کے تمام افراد پر ہر طرح کے معاملات میں ان کا نگراں اور ذمہ دار ہوا کرتا تھا اور امیر و حاکم اسی نقیب کے واسطہ سے بحیثیتِ مجموعی تمام افرادِ جماعت کے احوال و مسائل سے واقف ہوتا تھا۔

عقبہ ثانیہ کے اجتماع کے موقع پر آنحضورؐ نے اپنے حاضرین سے فرمایا تم سب اپنے لئے بارہ نقیبوں کا انتخاب کرو جو اپنی قوم اور اپنی جماعت کے تمام افراد کے ذمہ دار ہوں، بنی اسرائیل کے نقباء نے جس طرح اپنی اپنی قوم کی ذمہ داری قبول کی اور ہر طرح کے مسائل و معاملات میں ان کی نگہداشت کی، اسی طرح تمہارے نقیب بھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں(۱)، نقباءِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

وَلقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منہم اثنی عشر نقیباً۔ (۲)	اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے تھے۔

(المائدۃ: ۱۲)

---

(۱) الروض الانف للسہیلی ۲/۱۸۹ (شرح سیرت ابن ہشام)

(۲) نقیب کے معنی نگراں اور تفتیش کرنے والے کے ہیں، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اور اللہ تعالیٰ

امام بخاریؒ کی "صحیح بخاری" میں "قبیلہ ہوازن" کے ایک وفد کا مسلمان بن کر حضورؐ کی خدمت میں آنے کا واقعہ نقل کیا گیا ہے، وفد میں شامل تمام لوگوں نے آپ سے یہ درخواست کی کہ مال کو چھوڑ کر صرف اُن کے قیدی ان کے حوالہ کر دیئے جائیں، اس پر حضورؐ نے جب سارے لوگوں سے رائے معلوم کی تو لوگوں نے رضامندی کا اظہار کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں تم میں کس کی رائے کیا ہے؟ اس لئے جاؤ، اپنے امیر و ذمہ دار کو بھیجو کہ وہ تمہارا معاملہ یہاں پیش کریں۔ لوگ واپس ہوئے، بات چیت کے بعد پھر خود امیر و نقیب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو یہ اطلاع دی کہ تمام لوگوں نے خوش دلی سے اپنی رائے ظاہر کی ہے (۱)

امام ابوداؤدؒ نے اپنی سنن (ابوداؤد شریف) میں ایک موقع پر امارت و قیادت کے مسائل کے تحت "باب فی العرفاء" کے نام سے ایک عنوان قائم کیا ہے جس کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افراد کے ہر مجموعہ اور جماعت پر نگہبانی و رہنمائی کے لئے کسی فرد کو عریف اور سربراہ بنانا مناسب اور برمحل ہے اور لوگوں کی خیر و صلاح کی سمت رہنمائی اور اطاعت شعارانہ جذبہ کی تلقین کے لئے "عرفاء" کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ "عرفاء" جہنم میں ہوں گے" (۲)

مشہور شارحِ حدیث حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "فتح الباری" میں ابن بطالؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں "عرفاء" کی ایک

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نے ان میں سے ہر قبیلہ پر ایک ایک نقیب خود اسی قبیلہ سے مقرر کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ ان حالات پر نظر رکھے اور انہیں بے دینی و بداخلاقی سے بچانے کی کوشش کرتا رہے (مترجم)

(۱) صحیح بخاری ۹/۸۹ ۔ (۲) ابوداؤد:

پہلو سے جو مذمت بیان ہوئی ہے اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ افرادِ جماعت پر عریف اور سربراہ متعین نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کا جو امیر اور حاکم ہو اس کے لئے تمام امورِ حکمت کی بذاتِ خود دیکھ بھال اور براہِ راست نگرانی و تفتیش ممکن ہی نہیں، اس لئے امیر و حاکم کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں معاونین کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ عریف اور سربراہِ جماعت کا تقرر ممنوع ہے، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ کسی قبیلہ یا جماعت کی امارت و قیادت قبول کرنا کسی دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے اس کے لئے غیر معمولی احتیاط اور نزاکت ضروری ہے، ہر وقت دل میں اللہ کا خوف ہونا اور خدا کی نزدیکی اور قربت حاصل کرنے کی فکر و جستجو بھی ضروری ہے ورنہ پھر ہلاکت اور خطرہ کی کھائی میں گرنے کا اندیشہ ہے (۱)

حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابہ" میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابو عزیز، حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا تو آپؐ نے خود انہیں کو اپنی قوم کا سربراہ مقرر فرما دیا، حضرت رافع بن خدیج مدینہ میں اپنی قوم کے ذمہ دار و امیر تھے۔

قبیلہ بنو نجار کے امیر و نقیب اسعد بن زرارہ کا انتقال ہو گیا تو قبیلہ کے لوگ حضورؐ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے نقیب و امیر انتقال کر گئے، اس لئے اب ہم میں سے کسی کو نقیب بنا دیجئے۔

آپؐ نے فرمایا: "میں تمہارا نقیب و امیر ہوں" (۲)

(مذکورہ ارشادِ نبویؐ سے نقیب کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ صالح زندگی کی تعمیر میں کسی کی رہنمائی اور نگرانی کا بڑا اثر ہوتا ہے، اس سے فرد کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور پورے سماج و معاشرہ کی روحانی و اخلاقی تعمیر بھی)

---

(۱) فتح الباری ۱۳/۱۶۹۔ (۲) التراتیب الاداریۃ للکتانی ۱/۲۳۵۔

منصبِ امانت کی پاسداری

قرآن مجید کی یہ آیت یقیناً آپ کی نظر سے گذری ہوگی۔

انا عرضنا الامانۃ علی	ہم نے (یہ) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش
السّمٰوات والارض والجبال فابین	کی سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اسے اٹھائیں
ان یحملنھا واشفقن منھا و	اور وہ اس سے ڈرے اور اسے انسان نے
حملھا الانسان انہ کان	اپنے ذمہ لے لیا، بیشک وہ بڑا ظالم ہے
ظلوماً جھولا۔ (الاحزاب: ۷۲)	بڑا جاہل ہے۔

اس آیت میں جس امانت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اپنے اندر وسیع معنی و مفہوم رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسی گرانقدر شئ ہے، جسکی حفاظت و نگہداشت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل نہایت ضروری ہے۔ اگر اس کا بوجھ کسی دوش ناتواں پر رکھ دیا جائے یا وہ کسی نااہل اور غیر مستحق کے ہاتھوں میں چلی جائے اور مسلمانوں کے امور و معاملات کی باگ ڈور ان افراد کے ہاتھوں میں ہو جو کسی طرح منصبِ "امانت" کے لائق اور اس عظیم ذمہ داری کو سنبھالنے اور نبھانے کے لائق نہ ہوں تو پھر اس کی ہلاکت خیزی، بے توقیری اور ضیاع یقینی امر ہے جیسا کہ امام بخاری کی "الجامع الصحیح" میں منقول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

(۱) بخاری (فتح الباری: ۵۹)

آنحضورؐ نے فرمایا: جب "امانت" ضائع ہو جائے اور اس کی حیثیتِ عرفی ختم ہو جائے اور لوگوں کی نگاہ میں وہ ایک بے حقیقت شئی بن کر رہ جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔ حضرت ابوہریرہؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ امانت کس طرح ضائع ہوتی ہے اور وہ کیوں کر بے قیمت و بے وزن ہوتی ہے؟ فرمایا کہ جب سلطنت و حکومت، امارت و ریاست اور خلافت و امانت کا گراں بہا منصب، نااہل اور غیر مستحق لوگوں کے ہاتھ میں چلا جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اسی لئے اس منصب پر ایسے افراد کو منتخب کرنا چاہیئے جو اپنی لیاقت و صلاحیت، دیانت و راست گوئی اور صدق و وفا کے لحاظ سے پورے طور پر اس کے اہل ثابت ہوں۔ منصبِ "امانت" کی اسی اہمیت اور اس مقام کی نزاکت کے پیش نظر حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں:

جس شخص نے کسی آدمی کو مسلمانوں کی کسی جماعت کا امیر اور امین مقرر کیا جب کہ اسی جماعت میں کوئی ایسا فرد بھی ہو جو اس منصب کے لئے اس سے زیادہ موزون اور لائق و فائق ہو تو ایسا شخص درحقیقت خدا اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کا مرتکب ہے۔ اسی طرح جو آدمی اسلامی حکومت کا والی اور مسلمانوں کا امیر مقرر ہو، اور اس نے اقربا پروری، دوست نوازی اور جانبدارانہ انداز میں سلطنت و حکومت کے کسی اہم شعبہ یا منصب کے لئے اپنے کسی قریبی شخص کا انتخاب کیا تو یہ بھی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت اور مسلمانوں کے ساتھ فریب و دغابازی ہے (حاکم)

اس لئے ریاست و حکومت کے تخت اقتدار کے خواہشمندوں اور مسلمانوں کی امارت و قیادت کی حرص رکھنے والوں کو اس منصب سے

دور رکھنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہم اس کام کو ان لوگوں کے سپرد نہیں کریں گے جو خود اس کے حصول کی خواہش اور طمع رکھتے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس منصب "امانت" کی سپردگی میں بے راہ روی برتی گئی، کسی قرابت اور رشتہ داری یا پس پردہ کسی مادی منفعت اور رشوت خوری کی بنیاد پر کسی نے اس منصب کا سودا کیا اور کسی نااہل کے حوالہ کر دیا، یا کسی صاحبِ لیاقت فرد کو محض اس سے عداوت اور بغض و عناد کی بنا پر اس کے حق سے محروم اور دور رکھا تو وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کا خائن ہے۔ ایسا شخص اپنے عمل سے یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن کا یہ ارشاد نازل ہوا ہے:

یٰایھا الذین اٰمنوا لا تخونوا	اے ایمان والو خیانت نہ کرو اللہ اور رسول
اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم	کی اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو،
وانتم تعلمون۔ (الانفال: ۲۷)	درانحالیکہ تم جانتے ہو۔

ہاں اگر واقعی کوئی مناسب آدمی نہ مل سکے تو پھر درجہ بدرجہ نسبتاً بہتر اشخاص کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ انتخاب کا یہ کام پورے غور و فکر، تلاش و جستجو اور امکانی کوشش سے کیا جائے تو بس امانت کی ذمہ داری پایۂ تکمیل کو پہنچی اور آپ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے (۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو امورِ جہاں بانی و جہاں بینی کے سب سے بڑے رمز شناس تھے، نے ایسے لوگوں کو امیر اور والی سلطنت بنانے سے منع فرمایا جو ذہنی اور دماغی توازن اور سنجیدگی، متانت اور شائستگی کی نعمت

---

(۱) السیاسۃ الشرعیہ ص ۱۱ — ۱۴۔

سے محروم ہوں۔ اسی طرح آپؐ نے کسی ناتواں اور ضعیف الحال شخص کو، خواہ وہ اپنی ذات میں کتنا ہی صالح اور نیکو کار کیوں نہ ہو، ذمہ دار اور امیر بنانے سے روکا ہے۔ اسی لئے ایک موقع پر آپؐ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، اے ابوذر! تم ایک کمزور اور ناتواں آدمی ہو، میں اپنے لئے جو پسند کرتا ہوں وہی تمہارے لئے بھی پسند کرتا ہوں۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ تمہیں کسی جماعت کی خواہ اس میں دو افراد ہی کیوں نہ ہوں امارت قبول نہ کرنی چاہئے اور نہ کسی یتیم کے مال کی ذمہ داری اور نگہبانی (۱) (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کسی شخص کو کسی قابل ترجیح شرعی مصلحت کی وجہ سے امیر مقرر فرماتے، جیسے حضرت عمرو بن العاصؓ کو غزوۂ ذات السلاسل میں محض انکی جنگی مہارت اور عسکری تدابیر سے واقفیت کی وجہ سے ایسے لوگوں پر امیر مقرر کیا گیا جو خود ان سے زیادہ افضل اور قابلِ احترام تھے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو کم سنی کے باوجود قافلۂ شام کا امیر مقرر کیا گیا تاکہ وہ غزوۂ موتہ میں جامِ شہادت نوش کرنے والے اپنے والد حضرت زید کے قتل کا انتقام لے سکیں۔

ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ جو آدمی امارت و قیادت کا طالب ہو اس کو اس منصب سے دور رکھا جائے۔ اس لئے کہ اس میں انانیت اور نفسانیت کو راہ پانے کا موقعہ اور حوصلہ ملتا ہے۔ تاہم کسی خاص مصلحت کے تحت کسی ایسے فرد کو جو اس منصب کا طلبگار ہو امیر بنایا جاسکتا ہے، یہ ایک استثنائی شکل ہے۔

---

(۱) اس حدیث میں جس کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے مراد جسمانی ضعف بھی ہوسکتا ہے اور قوتِ فیصلہ کی کمزوری بھی مراد ہوسکتی ہے۔ (مترجم)

حضرت صدائی رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس سلسلہ کی ایک نظیر ہے، انہوں نے آنحضورؐ سے امیر بنائے جانے کی درخواست کی تو استثنائی صورت اور حکمت و مصلحت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر آپؐ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا اور خود ان کی اپنی قوم اور قبیلہ پر امیر مقرر فرمایا۔ اس استثنائی شکل کی وجہ یہ تھی کہ حضرت صدائی اپنے قبیلہ اور قوم میں نہایت ہر دلعزیز اور ہر کس و ناکس کے لئے محبوب اور پسندیدہ تھے۔ وہ اپنی قوم کے غیر نزاعی قائد اور قابلِ قبول رہنما تھے۔ حضورؐ نے جب ان کے سوز دروں اور جذبۂ اخلاص کو دیکھا تو انہیں امیر مقرر فرمایا تاکہ ان کا امیر بنایا جانا ایک قوم اور ایک کنبہ کی اصلاح اور دعوتِ دین کی قبولیت و وسعت کا ذریعہ بن جائے۔

عہد نبویؐ کے اس واقعہ سے علامہ ابن قیم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کسی بڑے قائد و امام نے امارت کی سپردگی کی درخواست کی اور وہ واقعی اس منصب کا اہل اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے موزوں ہے اور شرعی مصلحت بھی اس کے موافق ہے تو ایسے شخص کو امیر بنایا جا سکتا ہے[۱]

شیخ ابوبکر طرطوشی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"جب کوئی شخص بادشاہ یا ایسی قوموں کے درمیان ہو جو اس کی قدر و قیمت سے آگاہ نہ ہوں اور اسے اپنے تئیں ان سے شر کا اندیشہ محسوس ہو یا وہ واقعی صلاحیت کا اظہار کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے گنجائش ہے کہ ان کو اپنے مقام و مرتبہ سے باخبر کر دے اور وہ کچھ کرے جو بہتر طور پر اسکے لئے امکانی شر و فتنہ سے حفاظت کا ذریعہ ثابت ہو یا اس کے ذریعہ وہ اپنا واجبی اور صحیح مقام حاصل کر سکے۔"

اس میں ایک اور فائدہ بھی ہے کہ اگر وہ محسوس کر رہا ہے کہ قوموں کے معاملات بد دیانت اور خائن لوگوں کے ہاتھ میں چلے جا رہے ہیں اور وہ اپنے بارے میں اطمینان رکھتا ہو کہ وہ پورے طور پر اس بار امانت کا حق ادا کر سکے گا اور دیانت سے کام لے سکے گا تو ایسے مواقع پر بھی اس کے لئے ذمہ دار کو اپنی دیانت و لیاقت سے آگاہ کرنا درست ہے۔ اس طرح امت کے کام صحیح ہاتھوں انجام پا سکیں گے (۱)، حضرت یوسف کا عمل واضح نمونہ ہے کہ انہوں نے خود عزیز مصر سے خزانۂ مصر کے نظم و نسق کی خدمت کی بابت اپنے آپ کو پیش فرمایا اور فرمایا:

اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم۔ (یوسف: ۵۵) (۲)

(یوسف نے) کہا مجھے ملک کے پیداواروں پر مامور کر دیجئے میں دیانت (بھی) رکھتا ہوں، علم (بھی) رکھتا ہوں۔

---

(۱) سراج الملوک، ۷۹

(۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک آدمی اگر نیک نیتی سے یہ سمجھے کہ فلاں منصب کا میں اہل ہوں، اور دوسروں سے یہ کام اچھی طرح بن نہ پڑیگا، تو مسلمانوں کی خیر طلبی اور نفع رسانی کی غرض سے اسکی خواہش یا درخواست کر سکتا ہے، اور اگر حسب ضرورت اپنے بعض خصال حسنہ اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا پڑے، تو یہ ناجائز مدح سرائی میں داخل نہیں، حضرت عبدالرحمان بن سمرۃ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص از خود امارت طلب کرے تو اس کا بار اسی کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ (غیبی اعانت مددگار نہیں ہوتی) یہ اس وقت ہے جب طلب کرنا محض نفس پروری اور جاہ پسندی وغیرہ اغراض کی بنا پر ہو،

تقویٰ
شرف و فضیلت کی بنیاد

اسلام کا پیام اور اس کی دعوت ایک عالمی دعوت اور زندہ پیغام ہے۔ اس دعوت کی حامل قوم یعنی امتِ مسلمہ، ایک ایسی اکائی ہے جس میں مسلک و مشرب، رنگ و نسل، زبان و وطن اور طبقہ و جماعت میں فرق و امتیاز کا کوئی تصور ہی نہیں، نہ کسی عربی کو غیر عربی پر برتری حاصل ہے، اور نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے، شرف و عزت اور فضیلت و مرتبہ کی بنیاد صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے تقویٰ و پرہیز گاری۔

لیکن کیا آنحضورؐ کسی شخص کو خود اس کے اپنے قبیلہ اور قوم پر محض اس قوم کی، اس سے انسیت و محبت کی بنیاد پر ذمہ دار اور امیر مقرر فرماتے تھے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً ہمیں اثبات میں ملتا ہے اور اس پر بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔

صنعاء یمن پر متعینہ "نائب کسریٰ"، باذان نے جب اسلام قبول کیا تو آنحضورؐ نے صنعاء یمن ہی پر امیر مقرر فرمایا، حجۃ الوداع کے بعد جب باذان کا انتقال ہوا تو ان کے بعد ان کے لڑکے شہر بن باذان امیر مقرر کئے گئے۔

قبیلہ بنو تغلب اور عبس پر اسی قبیلہ کے ایک فرد شعبی کو امیر بنایا گیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو ان کے اپنے ملک یمن کے بعض علاقوں کی

تولیت سپرد کی گئی۔ حارث بن بلال طائی کو قبیلۂ بنوطیٔ پر اور حارث بن نوفل ہاشمی کو مکہ کے بعض حصوں کا امیر بنایا گیا۔ حضرت ابوبکر حضرت عمر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم نے بھی انہیں اسی جگہ کے لئے امیر بنایا۔ ہرماس بن زیاد الباہلی کو ان کے اپنے قبیلہ باہلہ کی ایک جماعت پر امیر مقرر کیا گیا۔ حضرت سعد الدوسی نے جب اسلام قبول کیا تو انہیں خود ان کے قبیلۂ دوس پر امیر مقرر کیا گیا۔ حضرت سعید بن خفاف التیمی کو ان کے اپنے قبیلہ پر مامور کیا گیا تھا۔ اور حضرت ابوبکر نے بھی انہیں امیر بنایا، حضرت سعد بن عبداللہ بن ربیعہ کو طائف پر، صیفی بن عامر کو ان کی اپنی قوم پر اور حضرت عمرو بن سعید بن العاص کو وادیٔ القری پر امیر بنایا گیا۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی قوم کے نمائندہ فرد کو قوم کا امیر بنایا کرتے تھے تاکہ لوگ اس کی امارت و قیادت سے مطمئن رہیں اور ان میں کسی طرح کا کوئی نزاع پیدا نہ ہو، اسلام کا یہی مقصد ہے۔ وحدت و اجتماعیت اور دلوں کی ہم آہنگی ایک اہم شرعی مقصد ہے، جو بغیر کسی امیر کے تقرر کے ممکن نہیں،

چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی قوم میں سے بارہ افراد کو منتخب کرو جو اپنی اپنی قوم کے ذمہ دار اور امیر ہوں ——— اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش ہوتی تھی کہ ہر شخص میدانِ جنگ میں اپنی قوم کے پرچم تلے کھڑا ہو اور جہاد کرے۔

فتح مکہ کے موقع پر صحیح بخاری میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا، ابوسفیان کو وادی کے پاس روک

لو، تاکہ وہ اللہ کے لشکروں کا بچشم دید مشاہدہ کر سکیں۔

چنانچہ مختلف قبائل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابوسفیان کے سامنے سے ایک ایک کر کے گذرنے لگے، ان میں ایک جماعت کا گذر ہوا تو پوچھا یہ کون؟ کہا یہ قبیلہ غفار ہے، پھر قبیلہ جہینہ کا گذر ہوا پھر قبیلہ سلیم کا، یہاں تک کہ ایک ایسی جماعت کا گذر ہوا جس کی برابر کوئی اور جماعت نہ تھی، اس کے بارے میں ابوسفیان نے دریافت کیا تو کہا کہ یہ "انصار" ہیں، جن پر سعد بن عبادہ امیر و ذمہ دار ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل نظریۂ قومیت یا مادہ پرستانہ عصبیت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایسا آپؐ اس وقت فرمایا کرتے جب کوئی اہم شرعی مقصد اور دینی مصلحت کی تکمیل مقصود ہوتی۔

نظم و قانون

دینِ اسلام کی ہر چیز تنظیمی شعور اور تہذیبی اقدار کو ابھارتی ہے اور یہی بات تخلیقِ انسانی میں نظامِ خالقیت پر روشنی ڈالنے والی اس قرآنی آیت سے معلوم ہوتی ہے:

انا کل شیٔ خلقناہ بقدر (القمر: ۴۹) — ہم نے ہر چیز کو (ایک خاص) انداز سے پیدا کیا ہے۔

شریعت کے احکام و مسائل ہوں یا کائنات کی مخلوقات ہوں، سب میں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے مثلاً جنات اور فرشتے کہ ان میں سے ہر ایک کا ایک رئیس ہے، اس کی کچھ ذمہ داری ہے اور کچھ حدود و آداب ہیں۔

کسی بھی اجتماعی عمل میں خیر و برکت ضرور ہوتی ہے، اجتماعی کام کے جو مفید پہلو ہیں اور اس کے جو غیر معمولی اثرات مرتب ہوتے ہیں انہیں صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے ——— کسی بھی دائرہ میں ہونے والے اجتماعی عمل میں سب سے زیادہ خطرہ کی بات یہ ہے کہ اس "اجتماعیت" کا کوئی فرد اپنی کسی مفوضہ ذمہ داری کی تکمیل کیلئے دوسرے پر تکیہ اور بھروسہ کر کے بیٹھ جائے یعنی بالفاظِ دیگر بے ترتیبی اور انتشار کی کیفیت، اجتماعی عمل کی کامیابی کیلئے رکاوٹ ہے، اجتماعی عمل کو ہر طرح کے انتشار اور بگاڑ سے وہی نظام محفوظ رکھ سکتا ہے

جس سے کوششیں بارآور ہوتی ہوں، حقوق اور ذمہ داریاں پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہوں اور کم وقت میں زیادہ کام ہوتا ہو، یہی خصوصیات ہیں ایک منظم اجتماعی عمل کی۔

سیرتِ نبویؐ کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ آنحضورؐ کی سیرت کا ایک گوشہ وہ بھی ہے جس میں آپؐ کی نظم وقانون کے سلسلہ میں غیر معمولی بصیرت، سیاست وتدبیر اور حکومت وتنظیم اور امور جہاں بانی وکارِ جہاں بینی میں نبوی فراست کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں اور حضورؐ کا یہ عمل شرعی نقطۂ نظر سے دین میں کوئی اضافہ یا بدعت نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کیوں کہ آنحضورؐ نے لوگوں کے مراتب ودرجات کی مناسب ترتیب سے زمرہ بندی فرمائی اور قابلیت واستحقاق کے لحاظ سے مختلف کام مختلف لوگوں کے سپرد کئے اور انتظامی اعتبار سے خصوصیت وامتیاز کے حامل افراد پر توجہ فرمائی، شیخ عبدالحی الکتانی کی کتاب "التراتیب الاداریۃ" کے مطالعہ سے اس سلسلہ کی انتہائی اعلیٰ ترین مثالیں سامنے آتی ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مختلف علاقوں میں مقرر کردہ امراء اور قافلہ سالاروں سے خط وکتابت کرتے اور خود وہ امراء بھی برابر ربط رکھتے تھے، آپؐ نے کئی بادشاہوں اور سلاطین وحکمرانوں کے یہاں اسلامی دعوت کے خطوط بھیجے اور بسا اوقات بعض اہم شخصیات کو اپنا قاصد بنا کر روانہ فرمایا۔ عمرو بن حزم کو جب یمن کی طرف بھیجا تو ایک عہد نامہ لکھ کر دیا اور بعض دفعہ تو لوگوں کی امانتوں کو بھی آپؐ نے نوٹ کروایا۔

اس طرح کی چیزیں نظم ونسق کے اصول وآداب کی طرف توجہ دلاتی ہیں کہ ضرورت کے موقعہ پر وہ تمام کام کئے جاسکتے ہیں، جن سے اجتماعی نظام کو

تقویت اور استحکام ملتا ہو ——— ان میں بعض چیزیں تو وہ ہیں جو خود شریعت سے ماخوذ ہیں، مثلاً امانتوں کے بارے میں خود قرآن نے احتیاط کی تلقین کی ہے۔ اور کچھ چیزیں وہ ہیں جو عرف وعادت اور زمانہ کے تقاضوں اور مصلحتوں سے تعلق رکھتی ہیں (۱)

اس سلسلہ میں اصول صرف یہ ہے کہ نظم ونسق میں اختیار کیا جانیوالا کوئی کام کسی حکم شرعی کے خلاف نہ ہو، نظم کو برقرار رکھنے کیلئے جو طریقے اپنائے جائیں ان کو صرف عملی تنظیم کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھا جائے، اس کو اللہ کی طرف سے نازل کردہ قرآن کا درجہ نہ دیا جائے کہ ان طریقوں پر کسی طرح کا اصرار ہو ——— بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ طریقے یا قواعد تجربات کی روشنی میں تیار کئے گئے ہیں جس سے محض کام میں سہولت مقصود ہو ——— قوانین وضوابط کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ باہم اختلاف نہیں ہوگا، ہر ایک کی ذمہ داری اور اختیارات متعین ہوں گے، کسی غلطی اور چوک کے وقت بازپرس کی گنجائش رہے گی اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہم تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملے گا۔

اس طرح کے شروط وقوانین کی تعیین سے باہمی انس ومحبت اور اتفاق وخدمت کا ماحول باقی رہے گا، اختلاف وتفرقہ مسلمانوں کے درمیان راہ نہیں پائے گا ——— اور نظم میں تعاون کرنے والے تمام قوانین کی پابندی (اگر قوانین واصول خلافِ شرع نہ ہوں تو) یقیناً طاعت وعبادت متصور ہوگی، جب تک ہم ان قوانین کے پابند رہیں گے، اتفاق ووحدت اور خیر کا ثواب

---

(۱) التراتیب الاداریہ للکتانی ۱/۱۱۹۔

پانے والوں میں سے ہوں گے، اور اگر ہم نے ان کی خلاف ورزی کی تو ضرر اور شر کا نتیجہ ظاہر ہوگا اور ناچاقی و نااتفاقی پیدا کرنے کا گناہ سر آئے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"مسلمان اپنے عہد و پیمان اور تمام شرائط کے پابند ہیں اور مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے۔" (۱) ؛

---

(۱) صحیح (ارواء الغلیل ۵/۱۴۲۔)

؛ سطور بالا میں شیخ عبدالحی الکتانی کی کتاب "التراتیب الاداریۃ" کا حوالہ مؤلف نے دیا ہے اردو زبان میں بھی اس موضوع پر وقیع اور قابلِ قدر کام ہوا ہے اور عہد نبوی کے سیاسی نظم و انتظام پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی (مقیم پیرس) کی کتاب "الوثائق السیاسیۃ" اور اسی کا اردو ایڈیشن "سیاسی وثیقہ جات" (مطبوعہ لاہور) یا پھر "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" تو اس موضوع پر لکھی گئی نہایت اہم اور قیمتی تصنیف ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبیؐ میں بھی اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ نیز مولانا ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی کتاب "عہد نبوی کا نظام ریاست و حکومت" بھی موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یقیناً ایک علمی تحفہ ہے۔ (مترجم)

اصلاح کا حکیمانہ اسلوب

کسی بھی کام میں "تنظیم" کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، کوئی بھی عمل خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا اور معمولی کیوں نہ ہو، "تنظیم" اس کی کامیابی کی ضمانت ہے، اس کے بغیر کسی کام کے مفید نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ انسانی کوششیں بارآور نہیں ہوتیں۔ جہد و عمل اور محنت و مشقت کا کوئی حاصل سامنے نہیں آپاتا۔ "تنظیم نہ ہو تو اپنی صفوں سے اتحاد جاتا رہتا ہے، اجتماعیت و وحدت کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ آرا منقسم ہو جاتی ہیں، سوچنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ نتیجتاً اضطراب، بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دل بدلی کا رجحان فروغ پاتا ہے، صفیں ٹوٹنے لگتی ہیں اور اتحاد کی بجائے انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں حدیث کی کتابوں میں یہ صراحت ملتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں، خواہ وہ قریبی سفر ہو یا دراز کا، ایک یا دو سے زائد افراد جمع ہو جائیں تو ان میں ایک کو امیر بنا لینے کا حکم دیا ہے۔ سفر میں کسی کو امیر بنانے سے متعلق حضورؐ کا یہ حکم، صرف موقع سفر ہی کے لئے محدود نہیں بلکہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر بڑی چھوٹی اجتماعیت میں امارت و تنظیم ضروری ہے اور مقصود یہ ہے کہ ایسے مواقع پر

جہاں کہ اختلافِ رائے کی گنجائش ہو، ایک مشورہ، نظم اور متحدہ رائے پر عمل کیا جائے۔ اور یہ وہ رائے ہے جس کو "امیر" نے اختیار کیا ہو کہ اگر "امیر" کی رائے پر تمام لوگ متحد نہ ہوں تو پھر "امارت" ایک بے معنی اور بے فائدہ چیز ہو کر رہ جائے گی۔

اس سلسلہ کے شرعی احکام کا مقصود یہ ہے کہ خیر و فلاح اور دین و ملت کا کوئی بھی کام صحیح نہج پر ہو، دین کی نسبت پر کام کرنے والوں کے تمام امور، تنظیم، ترتیب، تہذیب اور اتفاق رائے کے ساتھ انجام پائیں اور اگر کسی وجہ سے کسی مسئلہ پر اختلافِ رائے ہو جائے تو ایسے موقع پر اپنے امیر و کبیر اور رئیس و صدر کی رائے کو قبول کیا جائے، امیر بنانے سے متعلق حکمِ شرعی کا خلاصہ یہی ہے۔

عہدِ نبوت میں بیعت کا جو طریقہ رائج تھا اور صحابۂ کرامؓ آنحضورؐ کے ہاتھوں پر جس انداز میں بیعت قبول کرتے تھے، اس میں بھی امیر کی اطاعت کی تلقین ہے، الفاظ بیعت کا ایک نمونہ، سیرتِ نبوی پر لکھی گئی ابن ہشام کی فاضلانہ تصنیف سے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر تنگدستی و فراخ حالی، ناراضگی و خوش دلی اور پسندیدگی و خفگی، ہر حال میں سمع و طاعت اور وفاشعاری پر بیعت کی اور اس بات پر بھی کہ ہم امیر کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے، جو کہیں گے سچ اور حق کہیں گے اور ہم جہاں کہیں ہوں، اظہارِ حق میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی پروا نہ کریں گے۔" الفاظ بیعت میں جس طاعت کا ذکر ہے وہ ظاہر ہے کہ خیر و معروف کے دائرہ میں ہے۔ تاہم معروف میں اطاعت، باہمی مشورہ

اور آپسی تبادلۂ خیال کے ساتھ ہونی چاہیئے۔

خود آنحضورؐ جن کی اصابت رائے اور صحت فکر پر ہمارا ایمان ہے۔ اپنے ساتھیوں سے سب سے زیادہ مشورہ کیا کرتے تھے جس کی وضاحت حدیث و سیرت کی کتابوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملتی ہے۔

غلطی کی اصلاح کے جو طریقے آنحضورؐ سے منقول ہیں، مربی اور امیر کے لئے ان کا لحاظ ضروری ہے، اسی طرح اختلافی مسائل جو کسی بھی مشترک ماحول کا ایک لازمی حصہ ہیں، ان میں احتیاط اور صرف نظر کی پالیسی اپنائی جانی ضروری ہے۔ اس لئے کہ بے احتیاطی اور بے راہ روی کا انداز، غلطیوں کی اصلاح اور کوتاہیوں کے سد باب کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے، بلکہ اس کی وجہ سے غلطی کا ارتکاب بار بار ہونے لگتا ہے یعنی اصلاح کا غلط انداز، مزید بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ لوگوں میں بے راہ روی اور لاپروائی کے مزاج کو تقویت ملتی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان افراد کے ساتھ بڑی نرم خوئی اور نرم گفتاری سے پیش آتے، جو کسی غلطی کے مرتکب ہوں۔

حدیث و سیرت کی کتابوں میں اس سلسلہ کی بہت سی نظیریں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ایک موقع پر آپؐ نے غلطی کی اصلاح کیلئے براہِ راست غلطی پر متنبہ فرمانے کا طریقہ اختیار کیا۔ ایک صحابی بیمار تھے، سفر کے دوران رفقاءِ سفر نے انکو غسل کرنے کا مشورہ دیا، حالانکہ ان کے لئے تیمم کافی تھا، غسل کرنے کے بعد انکی وفات ہوگئی۔ آپؐ نے اس پر سخت نوٹس لیا اور ارشاد فرمایا: "لوگوں نے ان کو مار ڈالا، اللہ ان کو ہلاک کرے کیا ناواقفیت کا علاج یہ نہیں کہ جو باتیں نہ جانتے ہوں، ان کے بارے میں

استفسار کرلیا جائے۔ (ابو داؤد)

کبھی آپؐ غلطی کی اصلاح کے لئے ایسا اسلوب اختیار فرماتے کہ مخاطب کو غلطی کا احساس بھی ہو جاتا اور خیر و معروف کی طرف نہ یہ کہ رہنمائی ہوتی بلکہ اس کے لئے طبیعت میں آمادگی اور اندر سے اطاعت کی کیفیت پیدا ہوتی۔ خریم بن فاتک نامی ایک شخص تھے۔ ایک موقع پر ان کے سر کے بال کافی بڑے ہو چکے تھے اور ازار یعنی پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہو گیا تھا، تو آپؐ نے انہیں دیکھ کر ارشاد فرمایا "خریم بن فاتک بہت بھلے آدمی ہیں اگر ان کے سر کے بال بڑے اور پاجامہ ٹخنوں سے نیچے نہ ہوتا"۔

کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضرین میں سے کسی کی کوئی غلطی دیکھ لیتے تو غائبین (یعنی غیر موجود لوگوں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے، پتہ نہیں ان لوگوں کو کیا ہو گیا، وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

اور کبھی موقع حال کی مناسبت سے مناسب زجر و توبیخ کا اسلوب اختیار فرماتے ——— بخاری شریف میں ہے کہ آپؐ نے ایک خاص واقعہ میں حضرت ابو ذر غفاری کی فہمائش کرتے ہوئے فرمایا کہ "کیا تو نے اس کو ماں کے حوالہ سے عار دلائی، تم ایسے شخص ہو جس میں ابھی جاہلیت کا اثر باقی ہے"۔

کبھی آپؐ ترکِ گفتگو، قطعِ تعلق کا طریقہ اختیار کرتے، ابن بادیسؒ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھیوں سے گفتگو کرنے سے تمام صحابہ کو منع فرما دیا۔ اسوۂ رسولؐ کے اس پہلو میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس شخص کی معصیت اور خطار کا اظہار ہو جائے، اس سے ترکِ گفتگو، اس کا مقاطعہ اور بائیکاٹ اور سلام کرنے

سے گریز ضروری ہے تا آنکہ وہ توبہ نہ کرلے، یہ حکم زجر و توبیخ اور سرزنش کے طور پر ہے۔

امام طبریؒ کہتے ہیں کہ آپؐ نے حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھیوں سے ترکِ کلام کا حکم، محض ان حضرات کے غزوہ میں شرکت سے پیچھے رہ جانے کے سبب دیا حالانکہ غزوہ سے پیچھے رہ جانا کوئی کفر اور ارتداد نہیں ہے بلکہ ایک غلطی ہے جس کا ان سے صدور ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ترکِ کلام کا حکم دیا گیا، یہاں تک کہ اللہ نے انکی توبہ قبول کی، پھر ان سے تعلقات کی بحالی کا قرآن مجید میں اعلان ہوا۔ لہذا ہر وہ شخص جس نے کوئی ایسی حرکت یا معصیت کی، جس سے حکمِ خدا اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو، اس میں کسی طرح کی کوئی تاویل کی گنجائش بھی نہ ہو اور معصیت کا معصیت ہونا ظاہر ہو چکا ہو تو اس سے گفتگو ترک کر دینا چاہیئے یہاں تک کہ اسکی صریح توبہ معلوم نہ ہو جائے۔

حدیث نبوی کی معروف کتاب "مؤطا" کے شارح نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد

لایحل لرجل ان یھجر اخاہ فوق ثلاث۔

کسی آدمی کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ ترکِ گفتگو کرے

پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ حکم عام ہے اور حدیث کعب بن مالک اس عموم میں تخصیص پیدا کرتی ہے اور وہ اہل بدعت و اہل معصیت سے ترکِ تعلق میں بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ جو آدمی دین کے کسی باب میں کوئی نیا اضافہ اور بدعت کی کوئی ایسی صورت پیدا کرے جسے شریعت ناپسند کرتی ہو اور جس آدمی کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے میں لوگ اپنے دین کا یا دنیا

کا نقصان باور کرتے ہوں اور اسے عداوت و بغض میں اضافہ کا ذریعہ تصور کرتے ہوں تو ایسے شخص سے دور رہنا اور بعد اختیار کرنا بھی بہتر ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک عیسائی سے گفتگو کرنے سے منع فرمادیا تھا جو مشکلاتِ قرآن د) سے متعلق بہت زیادہ سوال کرتے، چنانچہ اس سے لوگوں نے گفتگو ترک کردی ——— پس سنت کی خلاف ورزی کرنیوالوں سے ترکِ تعلق و ترکِ گفتگو کا عمل تمام ہی صحابہ و تابعین کے یہاں پایا جاتا ہے۔

داعی کا امتحان

دینی دعوتوں اور تحریکوں کا ابتلاء و آزمائش سے دوچار ہونا سنت الٰہی کا ایک حصہ ہے اور آزمائش کی منزل سے گذرنا ہی ان دینی دعوتوں کی حقانیت و صداقت کی دلیل اور ثبات و استقامت کی علامت ہے، فتنہ و آزمائش دراصل کسی بھی تحریک و دعوت کے وجود و بقاء اور اس کے حاملین کے خلوص و یقین، سچائی اور نیک نفسی کی پہچان کا اہم ذریعہ ہے، اس سے کسی بھی دینی دعوت کے علمبرداروں میں مخلصین کے خلوص اور وفاشعاروں کے عزم و استقلال کی جانچ مقصود ہوتی ہے، اور منافقوں اور بدخواہوں کی دسیسہ کاری اور مجرمانہ خیانت و دغابازی کرنے والوں کا اصل چہرہ بے نقاب ہوتا ہے، دل کا بغض و عناد اور ذہن و دماغ میں پرورش پانے والی فتنہ انگیزی آشکارا ہوتی ہے — دوستی اور محبت کے قالب میں عداوت و دشمنی رکھنے والوں کے منافقانہ جذبات و احساسات منظر عام پر آتے ہیں، اسی حقیقت کو قرآن مجید نے اس طرح تعبیر کیا ہے:

ولنبلونکم حتی نعلم	اور ہم ضرور تم سب کی آزمائش کریں گے تاکہ
المجاھدین منکم والصابرین	ہم ان لوگوں کو معلوم کرلیں جو تم میں جہاد کرنیوالے
ونبلوا اخبارکم۔ (محمد: ۳۱)	ہیں اور جو ثابت قدم رہنے والے ہیں

اور تاکہ تمہاری حالتوں کی جانچ کرلیں۔

∴ ∴ ∴

ہر جگہ اور ہر زمانہ میں کچھ ایسے چنیدہ لوگ ہوتے ہیں جو پیہم آزمائش کی گھڑیوں سے دوچار ہوتے ہیں، اسلامی تاریخ میں افراد و شخصیات کی ایک طویل فہرست ہمیں نظر آتی ہے، جنہیں اپنی داعیانہ زندگی اور قائدانہ کردار میں مخالفت، ابتلاء اور آزمائش کے طوفانِ بلاخیز کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان مخالفتوں کے بالمقابل وہ "کوہِ استقامت" بنے رہے۔

مامون نے اپنی مطلب برابری کے لئے بہت سے فقہاء و محدثین کو تعریض و تنقیص کا نشانہ بنایا تھا، علماء و فقہاء میں سے ہر ایک کے عیوب و نقائص لوگوں کے سامنے بیان کئے، امانت میں خیانت، سود خوری اور ناجائز کمائی جیسی تہمتیں لگائیں، اس کی غیر دانشمندانہ بلکہ مجرمانہ سیاست جو بالآخر ناکامی کے انجام سے دوچار ہوئی، کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ لوگوں کو ان کے راز و نیاز سے بے نقاب کر دیتا، مختلف طرح کی تکلیفوں اور سزاؤں سے ڈراتا دھمکاتا، تاکہ زبردستی اس کے عقیدہ و خیال سے اتفاق پر لوگ مجبور ہو جائیں (۱)، اس سلسلہ میں کتبِ تاریخ میں سیّدنا

---

(۱) مامون نے خلقِ قرآن کے مسئلہ پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دی، ۲۱۸ھ میں اس نے والیٔ بغداد کے نام ایک تفصیلی فرمان بھیجا، جس میں عام مسلمانوں اور خصوصاً محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلقِ قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کی جائے ـــــ تفصیل کیلئے کتبِ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے (مترجم)

امام احمد بن حنبلؒ کا نام نامی اسم گرامی ایک روشن مثال ہے (۱) ——— ان کے یہاں علماء کے حالات سے واقفیت کے لئے خبر رسانی بلکہ جاسوسی کا

---

(۱) مسئلہ خلقِ قرآن کی مخالفت اور عقیدۂ صحیحہ کی حمایت اور حکومتِ وقت کے مقابلہ کی ذمہ داری تنہا امام احمد بن حنبلؒ کے اوپر تھی جو گروہِ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے۔ امام احمدؒ کو رقہ سے بغداد لایا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں، تین دن تک ان سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا، لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے۔ چوتھے دن والیٔ بغداد کے پاس ان کو لایا گیا، اس نے کہا کہ احمد! تم کو اپنی زندگی ایسی دوبھر ہے، خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا۔ اس کے بعد امام کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ جلاّد صرف دو کوڑے لگاتا تھا، پھر دوسرا جلاّد بلایا جاتا تھا، امام احمدؒ ہر کوڑے پر فرماتے تھے "میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں" ——— جب سے وہ گرفتار کئے گئے رہائی کے وقت تک اٹھائیس مہینے ان کو حبس میں گذرے، ۳۳ — ۳۴ کوڑے لگائے گئے ..... امام احمدؒ کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرہ سے محفوظ ہو گئے جن لوگوں نے اس دینی ابتلاء میں حکومتِ وقت کا ساتھ دیا تھا اور موقع پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے اور ان کا دینی و علمی اعتبار جاتا رہا، اس کے بالمقابل امام احمدؒ کی شان (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

ایک مستقل شعبہ قائم تھا جو خلفاءِ بنو عباس اور بنو امیہ کے عہد ہی سے برابر جاری تھا، ایک زیرک و دانا عہدہ دار کی قیادت میں لوگوں کے مختلف داخلی و خارجی حالات کا یہ لوگ پتہ لگاتے تھے، بسا اوقات بعض مردوں اور عورتوں کی مدد سے ان سے علماء کے "اندرونِ خانہ" کی باتیں معلوم کی جاتی تھیں ——— حکومت کی ہر طرح کے خطرات سے حفاظت و سلامتی کے مقصد سے تمام قسم کی خبروں کا احاطہ کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر استعمال کی جاتی تھی ——— ادب و تاریخ کی کتابوں میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن سے عباسیوں کی بیدار مغزی اور حدودِ مملکت کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے سلسلہ میں ان کی واقفیت اور باخبری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ——— ابراہیم بن شاہک نے مامون کی عیب جوئی اور تحقیق و تفتیش کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک فوجی جنرل مامون سے ملاقات کے بعد گھر سے نکلتے ہوئے ایک دوسرے شخص سے کہنے لگا، کیا تم نے اپنی رعایا سے اس سے زیادہ باخبر کوئی بادشاہ دیکھا ہے؟ اس نے کہا، بالکل نہیں، (۱)۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) دوبالا ہوگئی۔ ان کی محبت اہلِ سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی ..... ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز، ان کی عزیمت اور استقامت، اس فتنۂ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کا تنہا مقابلہ تھا، یہی ان کے قبولِ عام اور بقاءِ دوام کا اصل سبب ہے۔ "آوازۂ خلیل زتعمیرِ کعبہ نیست ∴ مشہور شد ازاں کہ در آتش نکو نشست" (تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۱)

(۱) المحاسن والمساوئ (بیہقی) ۱/۱۱۵۔

عہدِ عباسی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عباسی حکومت اپنی دینی چھاپ اور فکر کو لوگوں پر مسلط کرنا چاہتی تھی، چنانچہ "خلقِ قرآن" کے مسئلہ میں اپنے نقطۂ نظر کو صحیح قرار دینے اور اس کی حمایت میں جو شدت برتی گئی ہے، وہ اس کی کھلی دلیل ہے۔

اپنے فکر و خیال کو سندِ صحت عطا کرنے کیلئے اس نے علماء کو قریب کیا، علماء کے علم و ورع کی شہرت اور ان کے عوام سے ربط و تعلق پر گہری نظر رکھی، بلکہ اہلِ حکومت نے اپنے عہد کے فقہاء و محدثین کے علمی حلقوں پر بے حد توجہ صرف کی، وہ عوام کے علماء سے غیر معمولی تعلقات سے خوفزدہ رہتے تھے، کیوں کہ کسی بھی مرکزِ خلافت کیلئے عوامی طاقت، بڑی زود اثر اور انقلاب آفریں سمجھی جاتی ہے۔ نظامِ حکومت پر نقد و تنقید کرنے والوں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی، بلکہ بعض مرتبہ ایسے لوگوں کی گرفتاری اور سزا و سرزنش بھی ہوتی تھی، یا پھر ان لوگوں کے کمزور پہلو اور عیوب تلاش کئے جاتے، منافقت، خیانت اور شہرت طلبی کا الزام دے کر انہیں خاموش کر دیا جاتا۔

ایک موقع پر مامون نے ان علماء و فقہاء کا بطور استہزا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ خود کو قبلہ" قرار دے کر لوگوں کی بھیڑ اپنے اردگرد جمع کرنا چاہتے ہیں، ناحق طور پر اور اپنی نااہلی کے باوجود، یہ حصولِ اقتدار کے آرزومند ہوتے ہیں" بلکہ "دینی کاروبار" کی اصطلاح جو موجودہ زمانہ کی ایک نئی تعبیر سمجھی جاتی ہے، وہ ان کے لئے ایک مانوس اور عام بات ہے، یعقوب اسحٰق الکندی نے معتصم کے نام اپنے خط میں ان علماء کے بارے میں تمسخرانہ انداز میں لکھا ہے کہ "یہ بے جا طور پر اپنی جھوٹی وجاہت و سیادت کو باقی رکھنے کے لئے اہلِ علم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ تو عوام پر اپنا رعب و وقار جتانا چاہتے ہیں

جب کہ حقیقت میں یہ علم سے بے بہرہ ہیں۔"

اس تفصیل سے یہ بات آپ پر واضح ہوئی ہوگی کہ ان علماء کو کس طرح آزمائش کے دور سے گذرنا پڑا، حکومتی سطح سے علماء کو نشانہ بنایا گیا، ان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی گئیں، اپنے مفادات کے لئے انہیں "دین کا تاجر" کہا گیا۔ اور نہ جانے کس کس طرح انہیں آزمائش وامتحان کے مرحلے طے کرنے پڑے، لیکن امتحان کی ان گھڑیوں میں وہ مکمل کامیاب رہے یہ ابتلاء و آزمائش کی صورتحال دراصل خلفاء وقت کے اہل علم واہل دعوت سے اختلاف کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ امام شعبیؒ نے کہا تھا کہ "آزمائش ایک طرح کی بدعت ہے" مطلب یہ ہے کہ کوئی حاکم وقت کسی آدمی کا اس طرح مواخذہ، تفتیش اور انکوائری کرے کہ اس سے ان باتوں کا بھی اقرار کرالے جو اس نے کی ہی نہ ہوں، (۱)۔

---

(۱) النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر ۴/۸۲۔

شعر و سخن

شعر و شاعری کو اصناف سخن میں سب سے زیادہ مؤثر، طاقتور اور زود اثر صنف قرار دیا گیا ہے کہ وادیٔ حسن و عشق اور جولانگاہِ فکر و عمل دونوں پر اس کے گہرے نقوش ثبت ہوتے ہیں، چونکہ شعر و سخن ایک ایسا موثر ہتھیار ہے جس سے کسی طور بے نیاز نہیں رہا جا سکتا، اس لئے اسلام نے اپنے روزِ اول ہی سے شعر و سخن اور شعراء کی حوصلہ افزائی کی ہے، چنانچہ ہر معرکہ کے بعد مسلمان شعراء کے جواب میں ہجو اور مذمت کے اشعار بھی نظم کرتے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے حوصلہ و ہمت کو قوت ملتی، فتح و ظفر مندی کا احساس طاقتور ہوتا، ان کے دل و جان حرکتِ عمل و قوتِ کردار سے سرشار ہوتے، اور اسی شاعری ہی کی وجہ سے بعض آزردہ خاطر اور رنجور دلوں کی تسکین ہوتی، مایوسیاں، امید میں اور امیدیں یقین میں تبدیل ہوتیں، جرأت و شجاعت، استقامت و عزیمت، جوش و ولولہ اور جوانمردی و بے باکی کی ایک لہر کاروانِ اسلام کی رگِ حیات میں دوڑ جاتی۔

خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت حسانؓ کے لئے مسجدِ نبوی میں منبر رکھوائے اور ان کے لئے دعا فرمائی کہ جب تک یہ اللہ کے رسول کی طرف سے دفاع کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ روح القدس کے

ذریعہ اُن کی مدد فرماتے ہیں۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی) کبھی آپؐ فرماتے "اللہ روح القدس کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے، میری طرف سے تم جواب دو" (بخاری) ایک موقع پر شعر کے مضمون کے بارے میں آپؐ نے فرمایا "بعض اوقات اس میں حکمت کی باتیں ہوتی ہیں" (بخاری، ابوداؤد)

عمرو بن شریدا اپنے والد شرید بن سوید ثقفی سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دن (سفر میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آپ ہی کی سواری پر سوار تھا، آپؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ کیا تمہیں امیہ بن ابی الصلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟ میں نے عرض کیا "ہاں یاد ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا، سناؤ، تو میں نے ایک بیت آپؐ کو سنایا، آپؐ نے فرمایا، اور سناؤ، میں نے ایک بیت اور سنایا، آپؐ نے پھر فرمایا اور سناؤ، تو میں نے اس طرح سَو بیت سنا ڈالے (مسلم) (۱)۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی مجلس میں سَو سے زائد دفعہ بیٹھا، وہاں میں دیکھتا تھا کہ بعض صحابہ شعر پڑھتے تھے اور عہدِ جاہلیت کی بعض یادیں تازہ کرتے، اس وقت حضورؐ خاموش رہتے

---

(۱) امیہ بن ابی الصلت ثقفی ایک جاہلی شاعر تھا لیکن اس کی شاعری خدا پرستانہ تھی اسی لئے آنحضورؐ کو اس کے اشعار سے دلچسپی تھی، اس کے بارے میں ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "وہ اپنی شاعری میں اسلام سے بہت قریب ہوگیا تھا" اسی طرح ایک اور موقع سے آپؐ نے فرمایا "اس کی شاعری مسلمان ہوگئی اور اس کا قلب کافر رہا" امیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور دین کی دعوت بھی پہنچی، مگر ایمان کی توفیق نہ ہوئی۔

(مترجم)

اور کبھی کسی بات پر مسکراتے۔ (ترمذی)

عمرۃ القضاء کے موقع سے جب مکہ میں داخل ہوئے تو ابن رواحہ آپؐ کے سامنے اشعار پڑھنے لگے، اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں ٹوکا کہ اے ابن رواحہ! رسولِ خدا کے سامنے اور حرمِ خداوندی کے دامن میں تم شعر پڑھتے ہو، آپؐ نے شعر کی تاثیر بیان کرتے ہوئے فرمایا، اے عمر! انہیں چھوڑ دو، کہ شعر قریش پر تیر سے زیادہ سخت اور زود اثر ہے (۱) خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کوئی شعر پڑھ لیتے تھے اور بعض اسفار میں حدی خوانی کی سماعت بھی فرمائی ہے، چنانچہ بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ایک غزوہ یا سریہ سے واپسی میں انجشہؓ کی سحر انگیز حدی خوانی سماعت کی تو فرمایا، اے انجشہ! "ان آبگینوں کا خیال رکھو" یعنی قافلہ میں موجود عورتوں کی وجہ سے آپؐ نے انجشہ کو اپنی وجد آفریں "حدی خوانی" میں قدرے تخفیف کی ہدایت کی۔

اس طرح صحابۂ کرام اور خود آنحضورؐ سے مختلف غزوات کے موقع پر رجزیہ اشعار پڑھنے کی کئی مثالیں موجود ہیں اور صحیح سند سے ثابت ہیں۔ اور یہ سب آپؐ کی موجودگی میں ہوتا رہا ہے تو پھر شعر و شاعری کا جواز کیسے نہ ہوتا؟

سیرتِ نبویؐ پر علامہ ابن ہشام کی فاضلانہ تصنیف کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ آنحضورؐ اور ان کے صحابہ کے ذوقِ شعر و سخن کی مثالوں سے دسیوں صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

غزوہ خندق کے موقع سے جب انصار جوش و جذبہ میں یہ شعر پڑھتے،

---

(۱) ترمذی، نسائی۔

۵

نحن الذین بایعوا محمّدا　　علی الجہاد ما بقینا ابدا

(ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت محمدؐ سے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہم زندہ رہیں)

تو اپنے وفاداروں اور سرفروشوں کے اس رجزیہ شعر کا جواب ان دعائیہ کلمات میں زبانِ مبارک سے نکلتا تھا ؎

اللّٰھمّ لا عیش الا عیش الآخرۃ　　فاغفر للانصار والمہاجرۃ

اے اللہ آخرت کے سوا کوئی زندگی نہیں　　انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما

آلاتِ موسیقی کے بغیر شیریں آواز میں، منظوم اور موزون کلام پڑھنے کو نغمگی کہتے ہیں، صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے اس کا جواز نقل کیا گیا ہے، جن میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ و تابعین ہیں، ائمہ اربعہ اور سفیان بن عیینہ سے بھی یہی منقول ہے، احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے اس پر علماء کا اتفاق بتایا ہے، اصحاب ظواہر کے علاوہ ابن طاہر نے صحابہ و تابعین کا اجماع نقل کیا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

"شعر بھی کلام ہے، اس میں جو اچھا ہے، وہ اچھا ہے اور جو بُرا ہے وہ بُرا ہے" (۱)

شیخ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: (۲) کہ علامہ ابن عبد البر نے حدی خوانی کے جواز پر اتفاق نقل کیا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کی نغمگی ہے ——— یہیں سے مناسکِ حج اور زیارتِ کعبہ کے شوق میں حجاجِ کرام کے ان اشعار پڑھنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، جن میں اس سعادتِ عظمیٰ پر اپنی قلبی واردات و کیفیات کا

---

(۱) دار قطنی نے یہی مضمون حضرت عائشہؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے (مترجم)　　(۲) فتح الباری ۱۰/۵۳۸۔

اظہار ہو، میدانِ جہاد میں مجاہدین کے اندر ایمانی جوش اور روحِ جہاد میں تازگی پیدا کرنے کے مقصد سے رجزیہ شعر گوئی اس کا ایک ثبوت ہے۔ عورتیں اپنے بچوں کو بہلانے کی خاطر جو نغمہ آمیز لوریاں دیتی ہیں اس کا جواز بھی یہیں سے نکلتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ نغمہ جائز ہے، جس میں اللہ کا ذکر، اس کی عظمت و توحید کا بیان اور اطاعت و محبت کی تلقین ہو، یا طاعات پر عمل آوری کیلئے باعث تقویت ہو، یا کسی مسرت اور خوشی کا اظہار ہو، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کے موقع پر مسلمانوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ عورتیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں:

طلع البدر علینا　　من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا　　ما دعا اللہ داع

(چودھویں کا چاند وداع کی گھاٹیوں سے ہمارے سامنے نکل آیا، جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں، ہم پر خدا کا شکر واجب ہے)

حدیث کی کتابوں میں اس طرح کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں ——— اس سلسلہ میں علماء نے اس حد تک اجازت دی ہے کہ اس میں کوئی فحش و منکر صنفی جذبات کو انگیز کرنے اور انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والے مضامین اور موسیقی نہ ہو، کیونکہ یہ اہلِ فسق کا شعار ہے۔ (۱) (واللہ اعلم)

---

(۱) اگر اشعار غلط جذبات کو ہوا دینے والے اور ہیجان انگیز ہوں ان کا سننا اور سنانا تو بہرحال کراہت سے خالی نہ ہوگا، اسی طرح اگر عورتیں غیر محرم اور اجنبی مردوں کے درمیان آکر گائیں تو یہ بھی ناجائز ہی ہوگا کہ شریعت نے اس باب میں جو احتیاط برتی ہے یہ اس کے خلاف ہے اسی طرح اگر گانے کے ساتھ مزامیر اور دوسرے آلات ہوں تو اس طرح گانا بجانا بھی جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے ——— علامہ شامیؒ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) نے نقل کیا ہے کہ گانے (غناء) کا اطلاق اس وقت ہوگا جب کہ تین باتیں پائی جائیں، اشعار ہوں، ان کو لحن کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کے ساتھ تالی بجائی جائے اگر ان میں سے کوئی ایک بات نہ پائی جائے تو اس پر گانے کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی طرح ایسے اشعار پر گانے کا اطلاق ہوگا جس میں کسی متعین زندہ مرد یا عورت کے اوصاف بیان کئے جائیں شراب کی ترغیب ہو یا کسی مسلمان کی ہجو ہو اور یہی پڑھنے والے کا مقصود ہو، اگر اس کو عربی زبان کے کسی اسلوب کو ثابت کرنے یا فصاحت و بلاغت کے سیکھنے کیلئے پڑھا جائے، یا ایسے اشعار ہوں جس میں اچھے مضامین ہوں، ان کو ترنم سے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں جب تک کہ آلاتِ موسیقی کی شرکت نہ ہو، نیز صوفیاء کے یہاں قوالی اور ان احکام کی رعایت کے بغیر سماع اور وجد و حال کی جو رسم جاری ہے وہ مکروہ اور دین میں بے اصل ہے، (شامی ۵/۲۲۲) ڈھول، طبلہ وغیرہ کی آواز کا سننا حرام و معصیت اور وہاں بیٹھنا فسق ہے (درمختار علیٰ ہامش الرد ۵/۲۲۳)

(مترجم)

دعوتِ خیر و دَفعِ شر

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر اور بھلی باتوں کے بارے میں سوال کرتے تھے اور میں شر (یعنی برائی، فتنہ اور فساد) کی بابت سوال کیا کرتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں اس میں گرفتار نہ ہو جاؤں، میں نے پوچھا، اے اللہ کے رسول! ہم جاہلیت اور شر کے دَور میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں خیر سے نوازا تو کیا پھر اس خیر کے بعد بھی شر پیدا ہو سکتا ہے؟ آنحضورؐ نے فرمایا، ہاں، میں نے پوچھا کیا پھر اس شر کے بعد دوبارہ خیر آئے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں لیکن اس میں کمزوری ہوگی (یعنی خالص بھلائی نہ ہوگی بلکہ برائی کی ظلمت اور کدورت بھی ملی ہوگی) فرمایا کہ کچھ لوگ ہوں گے جو میرے طریقے کے خلاف چلیں گے۔ ان کی بعض باتیں جانی پہچانی ہونگی، لیکن بعض باتوں میں تم اجنبیت محسوس کرو گے، میں نے پوچھا کیا اس خیر کے بعد شر آئے گا، فرمایا کہ ہاں، جہنم کے دروازے پر بلانے والے ہونگے جو ان کی بات مانے گا، وہ انہیں اس میں پھینک دیں گے، میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ان کے کچھ اوصاف بیان کر دیجئے فرمایا وہ ہمارے جیسے ہی ہوں گے، ہماری ہی زبان بولیں گے پھر

میں نے وہ زمانہ پالیا تو آپؐ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت، اجتماعیت اور ان کے ساتھ رہنا، میں نے کہا اگر مسلمانوں میں اجتماعیت نہ ہو اور ان کا کوئی امام بھی نہ ہو تو کیا کروں؟ فرمایا کہ پھر ان تمام جماعتوں سے الگ رہنا، خواہ تمہیں درخت کی جڑ چبانی پڑے یہاں تک کہ اسی حالت میں تمہاری موت آجائے۔"

(صحیح بخاری، ابواب الفتن)

صحابی رسول حضرت حذیفہؓ کے استفسار کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو باخبر کیا کہ آنے والے زمانہ کے حالات میں زبردست تبدیلی و انقلاب برپا ہوگا، خیر کے پردہ میں بعض شر سامنے آئیں گے، اس وقت غیر معمولی احتیاط اور ہوشمندی کی ضرورت ہے۔

حدیث مذکور میں آنحضورؐ نے اجتماعیت و وحدت کی طرف توجہ دلائی اور اس زمانہ کی بات آگاہی دی، جس میں مسلمانوں کا کوئی ایسا قائد و امام نہ ہوگا، جس پر سبھوں کا اتفاق ہو، اس لئے آپؐ نے اس بات کی تلقین فرمائی کہ تمام مسلمان ممکن حد تک ظلم و فساد اور شر و فتنہ کو ختم کرنے میں حصہ لیں، اس لئے کہ اگر مسلمان دفعِ شر اور ازالۂ فساد سے بھی باز آجائیں تو برائیاں اور زیادہ عام ہوں گی، ہر سو بے دینی بے حیائی اور بداخلاقی تیزی سے پھیل جائے گی۔

علامہ جوینیؒ فرماتے ہیں:

"کسی زمانہ میں اگر مسلمانوں کا کوئی حاکم و سلطان اور امام و امیر نہ ہو تو ممکن حد تک برائیوں کو دور کرنے کے لئے کوئی ٹھوس عملی اقدام ضروری ہے، ..... اگر مسلمانوں کی کچھ تنظیمیں یا جماعتیں اس کام کے لئے میدانِ عمل میں اتر آئیں اور شر و فساد کی بیخ کنی

کے لئے دینی و دعوتی شعور اور جذبۂ اصلاحِ خلق کے ساتھ مصروف عمل ہو جائیں تو یہ اصلاح و دعوت اور تعمیرِ اخلاق کا ایک بہت بڑا کام ہوگا ——— بعض باخبر اور ہوشمند اہلِ علم کا کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی امیر و حکمراں نہ ہو تو خود ہر شہر اور بستی کے لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کسی ایسے باشعور اور بااثر فرد کا قیادت کیلئے انتخاب کریں، جس کی تمام باتوں کو لوگ قبول کریں اور وہ ہر ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہو ——— اگر مسلمانوں نے اس طرح اپنا کوئی قائد تسلیم نہیں کیا اور ہر جگہ اپنی "انا" کو مسئلہ بنا کر انحراف اور کج روی کی روش اپنائی تو طرح طرح کے گمبھیر مسائل پیدا ہوں گے، ایک دوسرے کی مخالفت کا ماحول پیدا ہوگا اور اختلاف و تفرقہ کا ماحول ہی ان کا مقدر بن جائے گا۔" (۱)

بسا اوقات ایک مسلمان کچھ ایسے حالات سے دوچار ہو جاتا ہے جس میں وہ خیر اور معروف کے سلسلہ میں احکام الٰہی کی پابندی سے قاصر ہوتا ہے، حالات کے شکنجہ میں وہ اس طرح پھنس جاتا ہے کہ آزادانہ طور پر تعلیماتِ دین کی بجاآوری اس کے لئے ممکن نہیں ہوتی ——— ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"دین کی دعوت جس آدمی تک پہنچ چکی ہو اور وہ دار الکفر میں رہتے ہوئے اس پر ایمان بھی لے آتا ہو، ممکن حد تک اور اپنی معلومات کے دائرہ میں ڈرتا ہو ——— جیسے شاہ حبش نجاشی وغیرہ ——— دار الاسلام کی طرف ہجرت کر سکتا ہو نہ شرعِ اسلامی کی پابندی عقیدہ کے اظہار اور "دینی وابستگی" کے اقرار میں مختلف رکاوٹیں ہوں،

---

(۱) غیاث الامم للجوینی ص ۳۸۷۔

نیز اسلامی احکام سے باخبری اور شریعت کی تعلیم کا انتظام نہ ہو تو ایسا شخص یقیناً "مؤمن" ہے اور اہلِ جنت میں سے ہے، گویا وہ "آلِ فرعون کا مردِ مؤمن" ہے (۱) اپنے حالات کے لحاظ سے ایسے شخص کا معاملہ "زوجۂ فرعون" اور سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام ہی کی طرح ہے، حضرت یوسفؑ اہلِ مصر ——— کے ساتھ جب تھے تو ان کے لئے بھی شریعت پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا تھا"

---

(۱) قرآن مجید میں آلِ فرعون کے اس "مردِ مؤمن" کا تذکرہ سورۂ مؤمن میں موجود ہے، وہ تھے تو فرعون کے خاندانِ شاہی سے لیکن نہایت حق پسند اور خدا ترس آدمی تھے، اس وجہ سے ان کی تمام ہمدردیاں شروع ہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھیں، ان کا ذکر سورۂ قصص میں بھی گذر چکا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک قبطی کے قتل کا اتفاقی واقعہ پیش آگیا اور اعیانِ حکومت نے ان کے قتل کے مشورے شروع کر دیئے تو انہوں نے ہی حضرت موسیٰ کو اعیانِ حکومت کے اس ارادے سے باخبر کیا اور ان کو مصر سے کہیں باہر جانے کا مشورہ دیا، جس کے بعد حضرت موسیٰ مدین چلے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی نبوت سے پہلے بھی ان کو حضرت موسیٰؑ کی اصلاحی سرگرمیوں سے پوری ہمدردی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے واپسی کے بعد جب نبوت کا اعلان کیا تو یہ ان کی دعوت پر ایمان لائے لیکن اپنے ایمان کو انہوں نے ایک عرصہ تک پوشیدہ رکھا، انہوں نے غالباً یہ محسوس فرمایا کہ اس دور میں ایمان کو پوشیدہ رکھ کر حضرت موسیٰ اور ان کی دعوت کی جو خدمت وہ کر سکتے ہیں وہ خدمت علانیہ نہیں کر سکتے، وہ شاہی خاندان کے ایک فرد اور تمام شاہی حقوق و مراعات سے بہرہ مند تھے، آگے کی آیت سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فرعون کے دارالامر کے رکن بھی تھے، اگر اسی مرحلہ میں وہ اپنے ایمان کا اعلان کر دیتے تو فرعونی فوراً ان کے اوپر

ولقد جاءکم یوسف من قبل	اور یوسف اس سے پہلے واضح تعلیمات کے ساتھ
بالبیّنٰتِ فما زلتم فی شکٍّ ممّا جاءکم	آئے تو تم ان کی لائی ہوئی باتوں کی طرف سے
بہ۔ (غافر: ۳۴)	برابر شک ہی میں رہے۔

شاہِ حبش نجاشی ——— تخت شاہی کو اپنے زیر اثر رکھنے کے باوجود قوم ان کی مطیع و فرمانبردار نہ ہوئی ——— اسلام کے بہت سے ایسے احکام و تعلیمات

(بقیہ صفحہ گذشتہ) قومی غدار ہونے کا الزام لگا کر پوری قوم میں ان کو نکّو بنا دیتے۔

لیکن دین و ایمان کے معاملے میں مصلحت کا لحاظ اسی وقت تک جائز ہے جب تک اس سے دین کو نفع پہنچنے کی توقع ہو، اگر معاملہ اس مرحلے سے گذر جائے اور دین کو کوئی فیصلہ کن خطرہ پیش آجائے تو اس وقت اپنے ایمان کو چھپانا منافقت بن جاتا ہے، چنانچہ اس بندۂ مؤمن نے بھی اسی وقت تک اپنے ایمان کو پردے میں رکھا جب تک اس کے چھپانے میں دین کی مصلحت دیکھی، لیکن جب دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی ہے تو انہوں نے مصلحت کی نقاب اتار کر پھینک دی اور خم ٹھونک کر فرعون کے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حمایت بھی کی اور اپنے ایمان کا علیٰ رؤس الاشہاد اعلان بھی کر دیا۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کوئی شخص اگر لوگوں کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار نہ کرے، دل سے اعتقاد پختہ رکھے تو وہ مؤمن ہے مگر نصوصِ صریحہ سے یہ ثابت ہے کہ ایمان کے مقبول ہونے کیلئے صرف دل کا یقین کافی نہیں بلکہ زبان سے اقرار کرنا شرط ہے، جب تک زبان سے اقرار نہ کرے گا مؤمن نہ ہوگا۔ البتہ زبان کا اقرار لوگوں کے سامنے اعلان کے ساتھ کرنا ضروری نہیں، اس کی ضرورت صرف اس وجہ سے ہے کہ جب تک لوگوں کو اس کے ایمان کا علم نہیں ہوگا وہ اس کے ساتھ معاملہ مسلمانوں جیسا نہ کر سکیں گے۔

(مترجم)

ہیں، جن پر وہ طبعی خواہش کے باوجود عمل کرنے سے قاصر رہے، نہ ہی ہجرت و جہاد کیا، اور نہ بیت اللہ کا حج کیا، بلکہ روایتوں میں ہے کہ انہوں نے نماز تک ادا نہیں کی، رمضان کے روزے نہیں رکھے اور نہ زکوٰۃ ادا کیا، وہ چاہتے تھے کہ قرآنی احکام کے مطابق فیصلے کریں، لیکن قوم کے معاندانہ جذبہ کے پیش نظر وہ ایسا نہ کر سکے ——— بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص نے مسلمانوں اور تاتاریوں کے درمیان قاضی اور امام کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی عدل و مساوات کی قدروں کو عملی طور پر نافذ کرنے کی اس نے بہت کوشش کی، لیکن اسے کامیابی نہ مل سکی، بلکہ اس راہ میں مزید رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور قرآن مجید کا اصول ہے لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا (البقرہ: ۲۸۶)

اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا، مگر اس کی بساط کے مطابق۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں یہ بات ملتی ہے کہ قیام عدل کے سلسلہ میں ان کے بعض اقدامات پر لوگوں نے انہیں اذیت دی اور کہا جاتا ہے کہ اسی معاملہ میں انہیں زہر دیا گیا ——— معلوم ہوا کہ نجاشی اور ان جیسی پاک روحیں یقیناً جنت میں ہوں گی، اگرچہ کہ ان لوگوں نے "محض عدم قدرت اور ناموافق حالات" کے باعث اسلامی احکام کی پابندی نہ کی اور احکام شرع میں ان بنیادوں پر فیصلہ کیا جو ان کے لئے "ممکن تھیں" (۱)

علامہ ابن تیمیہؒ سے کسی نے استفسار کیا کہ ایک شخص ایک اہم منصب پر فائز ہوا اور اس منصب کی اہمیت کے لحاظ سے اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو بالکل شرع اسلامی کے مطابق انجام دینا چاہتا ہے، ظلم اور تعدی سے بیزار اور دور رہنا چاہتا ہے لیکن اس سے اونچے عہدہ دار اسے اس طرح کے عمل سے باز رکھتے

---

(۱) مجموع الفتاویٰ ۱۹/۲۱۷۔

ہیں اور غیر شرعی بنیادوں پر کام کی حاکمانہ و قاہرانہ تلقین کرتے ہیں ـــــ کیا اس کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ ممکن حد تک ظلم میں تخفیف اور شر و بدعملی میں قدرے کمی کرتے ہوئے اس منصب پر برقرار رہے ؟

ابن تیمیہؒ کا جواب اس طرح تھا :

" ہاں ! اگر وہ عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے کوشاں ہو اور ممکن حد تک ظلم کو دفع کرتا ہو تو اس کا اس منصب پر برقرار رہنا مسلمانوں کے لئے بہتر اور جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں، تاکہ کوئی اور زیادہ بدطینت و بےعمل شخص، اس منصب پر نہ آئے، ـــــ جہاں تک ہو سکے عدل کا قائم کرنا اور ظلم و فساد کا دور کرنا، فرض کفایہ ہے۔ اس سلسلہ میں ہر شخص خود سے جو کچھ کر سکتا ہے اسے سرانجام دے، بادشاہ یا اہلِ حکومت اس طرح کے عہدوں پر زبردستی کسی کا تقرر کرتے ہیں کہ ان سے بچنا اس کے لئے ممکن نہیں تو اس میں بھی کوئی مؤاخذہ نہیں ہے" (۱)

اس سلسلہ میں شیخ عز بن عبدالسلام نے اپنی کتاب " قواعد الاحکام فی مصالح الانام " میں بعض جزئیات کا تفصیل سے احاطہ کیا ہے، جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ـــــ تفصیلات کے خواہشمند یہ اور اس طرح کی بعض دیگر کتب سے مراجعت کر سکتے ہیں۔

۱۔ مجموع الفتاویٰ ۱۹/۲۱۷۔

تربیت کے جامع اصول

اسلام، ایک ہمہ گیر دعوت اور آفاقی مذہب ہے، اس کی جامع اور وسیع ترین تعلیمات کا دائرہ انسانی زندگی کے ہر مرحلہ کو شامل ہے۔ وہ کسی خاص طرزِ فکر اور مذہب و مسلک کی آمیزش کے بغیر ایک سیدھا سادہ دین اور خالص شریعت و تہذیب ہے۔ اس کی دعوت اور پیغام کی اصل بنیاد، علم، تربیت، اور جہاد و مجاہدہ ہے۔ اسلام کی دعوت، اصلاحِ تربیت کے کسی ایک گوشے یا مسلمانوں کی کسی مخصوص جماعت و تحریک تک محدود نہیں ہے۔

عقیدہ و عمل کے باب میں دعوتِ اسلامی کا اصل مأخذ قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور پیغمبرِ اسلامؐ کے ارشادات ہیں، سلف صالحین کی سیرت و کردار اور اسرارِ شریعت اور رموزِ طریقت کے شناسا علماء و اہلِ فکر کے بااعتماد مسلک پر یقین و اذعان، صحیح اسلامی فکر کی سمت رہنمائی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ فلسفیانہ مباحث و نظریات اور منطقیانہ قیاس آرائیوں کا اس باب میں کوئی دخل نہیں۔ تعلیم و تربیت اور کردار سازی و آدم گری کے باب میں دعوتِ اسلامی کا اصل محور قرآنِ مجید اور حدیثِ نبوی ہے اور یہی دونوں مقدس صحیفے پوری اسلامی تعلیمات کی اساس ہیں۔

بہت سے ایسے علوم و افکار جو اسلام سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسلامی رنگ و آہنگ رکھتے ہیں، وہ اپنے زمانہ و حالات اور اپنے زمانہ کی

قوموں کے اثر سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یعنی اسلامی تعلیمات کی ہر زمانہ کے لوگ اپنے اپنے اندازِ فکر کے مطابق تعبیر و تشریح کرتے ہیں۔ تعبیر و تشریح کے اس فرق و اختلاف کی وجہ سے بسا اوقات اسلامی تعلیمات کی روح متاثر ہو جاتی ہے۔ اس سے مختلف مکاتبِ خیال کی ترجمانی اور اہلِ نظر کی فکر و رائے کی نمائندگی تو ہو جاتی ہے لیکن اسلامی تعلیمات کا اصل سرمایہ افکار و خیالات کی تہہ میں دب کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن و حدیث اور دین و شریعت کی روشنی میں صحیح اسلامی دعوت اور بے داغ و بے آمیز دینی و اسلامی فکر کو خضر طریق بنایا جائے اور اس کی اشاعت کے لئے پیہم کوشش کی جائے۔ دعوتِ اسلامی کا فقہی نقطۂ نظر اور مزاج یہ ہے کہ عملی طور پر فقہی مسائل کی توضیح کی جائے۔ ترغیب و ترہیب کا پہلو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ عبادات میں شوق اور فضائلِ اعمال کی سمت سبقت کا جذبہ پیدا ہو۔ محرماتِ خداوندی سے اجتناب اور خوفِ خدا پیدا ہو ——— اسلامی فقہ اور دیگر مذاہب کے قوانین کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے اور اسلامی قانون سازی میں جو اسرار و رموز اور حکمتیں پوشیدہ ہیں، انہیں واضح کیا جائے۔ پھر فقہِ اسلامی کا قرآن و حدیث سے جو گہرا ربط ہے اور کتاب و سنت کے مضامین کی فقہ کے ذریعہ جس انداز میں توضیح اور عملی تطبیق ہوتی ہے، اسے پیشِ نظر رکھا جائے، جزئیات اور بعض دقیق اور پیچیدہ اصطلاحات میں لوگوں کو الجھانے اور اختلافی گوشوں کو نمایاں کرنے کی بجائے مثبت انداز میں فقہی مسائل و احکام سے واقف کرایا جائے۔ تفصیلی دلائل کی روشنی میں مجتہدین کے مسلکوں کا مطالعہ کیا جائے اور شرعی حدود کے دائرہ میں ان کے اجتہادات سے استفادہ

کیا جائے۔ فقہی احکام کی تدریس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتوں کی پیروی کی بطور خاص تلقین کی جائے کہ سنتِ رسول ہی دراصل ہمارے دین کی عملی تعبیر و تفسیر ہے۔

دعوت کی ایمانی اساس یہ ہے کہ ہر قسم کے خیر و صلاح کا سرچشمہ نفسِ انسانی کی پاکیزگی، قلب و ضمیر کی صفائی، عملِ صالح کا شوق و ولولہ اور اس پر پابندی، مخلوق سے اعراض اور خالق سے گہرا اور مستحکم تعلق، اللہ کے لئے دوسرے سے محبت اور رضاءِ الٰہی کے لئے ہی کسی سے نفرت و بغض اور خیر کے کاموں میں ربط و توافق کے لئے جہد پیہم اور سعی مسلسل جاری رہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ تعلیم و تربیت اور دینی ذہن سازی کے معاملہ میں حدیث و سنت کی تعلیمات سے تجاوز، بے ثبوت اور مبالغہ آمیز بنیادوں پر اعتماد اور منطق و فلسفہ کے اصول و مبادی کی روشنی میں تعلیم و تربیت کا خاکہ مرتب کرنے کی فکر و جستجو کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ گو کہ حدیث و سنت کی رو سے بہت سی کرامتوں کا حصول جائز طریقوں سے ممکن ہے لیکن سب سے بڑی عزت و شرف کی بات بندہ کے لئے یہ ہے کہ وہ ثبات قدمی اور دعوتِ اسلامی کے فروغ اور اس کی اشاعت کے لئے حسنِ توفیق کی نعمت سے بہرہ ور ہو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اللہ تعالیٰ کی حرام و ناجائز کردہ چیزوں پر اس کی غیرت و حمیت باقی اور زندہ ہو۔

اس حقیقت سے آپ ضرور باخبر رہیں کہ الہام، دل کے خیالات، کشف اور خواب وغیرہ کی حیثیت کسی حکمِ شرعی کی نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب اور بیداری میں دیدار صرف ان صحابہ کے لئے ممکن ہے جنہوں نے آپؐ کو اپنی زندگی میں دیکھا ہے اور جو آپؐ کی شکل و صورت سے

واقف ہیں۔ اس طرح کی چیزوں میں الجھ کر قرآنِ مجید سے مکمل طور پر بے اعتنائی اپنے شیوخ کے مقرر کردہ اوراد و وظائف اور روز و شب کے معمولات پر اکتفار کرنا اور قرآنِ مجید سے یکسر تغافل و چشم پوشی برتنا دراصل قرآنِ مجید کی حرمت و تقدس کے خلاف ہے۔ اور کتابِ الٰہی کے حقوق کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل سے مجرمانہ تغافل ہے۔ ہر چند کہ یہ اوراد و وظائف، احکامِ شریعت کے خلاف نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ کی کتاب (قرآنِ حکیم) ہر کتاب سے بڑھ کر ہے۔

اس پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے، اس کی تلاوت کی جائے اور قرآنی حلقوں میں بیٹھ کر اسے غور سے سنا جائے۔ فہم و تدبر اور خشوع و خضوع کی راہ سے اُسے اپنے دل میں اتارا اور بسایا جائے۔ زندگی کی کٹھن راہوں میں اس سے بصیرت و رہنمائی حاصل کی جائے۔ نیز حدیثِ رسولؐ کا بپابندی اور بکثرت مطالعہ کیا جائے، نیز اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی عملی تعبیر و تشریح کا فریضہ انجام دینے والے بزرگ علماء و صلحاء کی تاریخ، سوانح اور ان کی دعوتی و اصلاحی جدوجہد کا مطالعہ کر کے اپنے لئے بصیرت اور روشنی کا سامان فراہم کرنا چاہیئے، اس طریقۂ کار سے راستہ کی ظلمتیں اپنے آپ دور ہوتی ہیں اور توفیقِ الٰہی آپ کی رفیق بن جاتی ہے۔

کتابیات

مؤلف کتاب نے بطور حوالہ جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان کے نام درج ہیں

القرآن الکریم	
تفسیر القرآن العزیز	ابوالفداء اسماعیل بن کثیر دمشقی
صحیح بخاری	محمد بن اسماعیل البخاریؒ
صحیح مسلم	امام مسلمؒ
سنن ترمذی	ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ
سنن ابی داؤد	سلیمان بن اشعث ابوداؤدؒ سجستانی
مسند احمد	امام احمد بن حنبلؒ
طبرانی	امام طبرانی
النہایۃ فی غریب الحدیث والأثر	ابن الأثیر
فتح الباری	ابن حجر عسقلانیؒ
زاد المعاد	ابن قیم الجوزیہؒ
المغازی	ابن اسحاق
سیرۃ ابن ہشام	ابن ہشام
الروض الأنف (شرح سیرۃ ابن ہشام)	علامہ سہیلی
الاعتصام	امام شاطبیؒ

المحاسن والمساوی	امام بیہقی
شرح نخبۃ الفکر	
التراتیب الاداریۃ	عبدالحی الکتانی
رسالۃ الزجر فی الہجر	علامہ جلال الدین سیوطی
قاعدۃ فی الجرح والتعدیل	تاج السبکی
القواعد	ابن رجب الحنبلی
قاعدۃ فی العقود	ابن تیمیہؒ
مدارج السالکین	ابن القیم
اعلام الموقعین	ابن القیم
السیاسۃ الشرعیۃ	ابن تیمیہؒ
ارواء الغلیل	
سراج الملوک	ابوبکر الطرطوشی
رفع الملام عن ائمۃ الاعلام	ابن تیمیہؒ
خطط المقریزی	علامہ مقریزی
صحیح الجامع الصغیر	
فتح البیان	نواب صدیق حسن خان
تحکیم القوانین	شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ
مقدمۃ ابن خلدون	علامہ ابن خلدون
غیاث الامم	الجوینی
الفتاوی الکبری	ابن تیمیۃ
کشف الاسرار	البزدوی

مقدمة المغني	الشيخ رشيد رضا
الجواهر الكلامية	الشيخ طاهر الجزائري
الاصول العشرين	
البحر الزخار	
مختصر الفتاوى المصرية	ابن تيمية رح
الدرة المضية	تقي الدين السبكي
كتاب "الاصل"	
الفتاوى	الشيخ محمد بن ابراهيم آل شيخ
مجموع الفتاوى	ابن تيمية رح
الولاء والبراء	الشيخ عبد الرحمن عبد الخالق

یادداشت

یادداشت

حيدرآباد الهند

اس کتاب سے

"اس وقت ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں بہت سے ایسے اہم مسائل سے ہم دو چار ہیں جن کے مقابلہ کے لئے ہمیں سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہم آہنگ وہم آواز ہونے اور اختلافات کی خلیج کو پاٹتے ہوئے نقطہ ہائے اتفاق تلاش کرنے کی ضرورت ہے، حالات کی سنگینی اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک سنجیدگی کے ساتھ اپنی صلاحیت کو تولے، اور اپنی صلاحیت کار کے حدود میں خود کو محدود رکھے، نیز ہر جماعت اپنے دائرہ کار کو مسلمانوں کی کسی ایک یا متعدد مصلحتوں کی تکمیل میں وقف کردے، اس لئے کہ ہم ابھی تک مسلمانوں کے اتحاد کے خواب ہی دیکھ رہے ہیں لیکن فی الواقع ایک مخصوص تعداد کو چھوڑ کر مسلمانوں میں انتشار کی کیفیت بڑھتی ہی جارہی ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہمارا اختلاف رحمت کا باعث ہو نہ کہ وہ خدا کا عذاب بن جائے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ ہمارا اختلاف محض اس بات پر مبنی ہو کہ مختلف لوگ مختلف میدانوں میں کام کریں نہ یہ کہ ان مختلف کاموں میں باہم تضاد اور تناقض کی کیفیت ہو، کام کی نوعیت میں اختلاف کے باوجود باہمی تعاون کو شریعت اسلامی نے ہم پر واجب اور ضروری قرار دیا ہے۔

اس لئے مسلمانوں کی تمام جماعتیں اور تنظیمیں اپنے اپنے دائرۂ عمل کے اعتبار سے مختلف ومتنوع ہوں، امت کے مصالح ومفادات کی تکمیل کے عزم فلاحی ورفاہی کاموں میں تعاون واشتراک کے جذبہ اور دین کی بنیاد پر اخوت ومحبت کے سایہ میں تمام جماعتیں اپنا اپنا رول ادا کریں، ہر جماعت دوسرے کے بارے میں حسن ظن رکھے۔ اختلافی مسائل میں تہم پوشی اور تسامح سے کام لیا جائے اور ان اساسی اور بنیادی باتوں پر اپنی اجتماعیت کا بھرپور مظاہرہ کریں جن سے ایک مسلمان "مسلمان" بنتا ہے۔" (مؤلف)